تمدنِ اسلام

(دو مقالے)

بدالماجد دریا آبادی

ادارۂ ادبیاتِ دلی

تمدّنِ اسلام

(دو مقالے)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی

ادارۂ ادبیاتِ دلّی

جملہ حقوق بحق پبلیشر

•

بار اوّل ـــــــــــــــ ایکہزار

قیمت ـــــــــــــــ

طابع و ناشر ـــــــــــــــ شمیم احمد

برائے ادارہ ادبیات دلّی

مطبوعہ۔ ـــــــــــــــ جیّد پریس بلیماران دلّی

ادارۂ ادبیاتِ دِلّی

۲۰۰۹ ۔ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

تمدّنِ اسلام سے متعلق دو بے مثال مقالے

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر صدق جدید (لکھنؤ) کے یہ دو مقالے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی —— "انجمن اسلامی تاریخ و تمدن علی گڑھ" کے زیر اہتمام منائے جانے والے اسلامی ہفتہ کے ضمن میں علی الترتیب اگست ۱۹۴۸ء اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو رامپور حامد ہال اور اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی میں پڑھے گئے تھے۔ اس کے بعد انجمن مذکور کے زیر اہتمام تمدّنِ اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام اور تمدن اسلام کی کہانی اسی کی زبانی کے مقفیٰ اور پر کشش عنوانات کے ساتھ مفت تقسیم کی غرض سے شائع کئے گئے تھے۔ اسکے بعد وہ مولانا کے ہفتہ وار اخبار صدق لکھنؤ (جو اب صدق جدید کے نام سے نکل رہا ہے) میں شائع ہوئے۔ یہ انجمن عرصہ دراز ہوا مرحوم ہو چکی اور اس کے ساتھ اس کا یہ اسلامی لٹریچر

بھی ناپید ہو چکا۔

ادارۂ ادبیات دلّی مستحق مبارکباد ہے کہ اس نے ان جواہر پاروں کو از سرِ نو اور یکجائی صورت میں شائع کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ جس وقت یہ لکھے تھے، اس وقت بھی ایسے منکرین کی کمی نہ تھی جو اسلامی تمدن و تہذیب کے نفس وجود کے قائل نہ تھے۔ اور اب آزادئ ملک کے بعد بدلے ہوئے حالات میں اس اسلامی تہذیب و ثقافت کے وجود مسعود سے انکار کرنے والوں اور اس کی خوبیوں کو برائیوں سے تعبیر کرنے والے بے شمار پیدا ہو گئے ہیں۔ ان منکروں اور معترضوں کے سامنے تمدن اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرنے اور مسلمانوں کو اپنے تمدنی محاسن و مفاخر سے پوری طرح آگاہ کرنے کے لئے اس رسالہ کی دوبارہ اشاعت کی شدید ضرورت تھی۔ یہ ادبی ادارہ اپنی اس ملّی و دینی خدمت کے لئے مستحق مبارکباد و لائق ہمت افزائی ہے۔

حکیم عبدالقوی دریابادی
کچہری روڈ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

از فخر الاماثل و الافاضل حضرت الحاج مولانا حافظ قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی

مہتمم جامعہ قاسمیہ دار العلوم دیوبند

مولانا عبدالماجد دریابادی کی ذات گرامی اپنی گوناگوں قابلیتوں کے ماتحت علمی دنیا بلکہ پورے ملک میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، آپ کی ذات کے لئے خود آپ کی معیاری تصانیف اور پُر از معلومات مقالے کافی وجہ تعارف ہیں اور آپ کے ان علمی شاہکاروں یا قلمی کارناموں کے تعارف کے لئے یہ نسبت کافی ہے کہ وہ آپ کے بلند پایہ افکار ہیں۔ جو ذات اپنے کمال سے خود اپنے لئے

معرفی کر رہی ہو اُس کا تعارف کماحقہ کرایا بھی نہیں جاسکتا اور کرایا بھی جائے تو وہ تحصیل حاصل کا مصداق ہوگا۔

مشاہیر ملک میں مولانا ممدوح کی ذات اپنی نمایاں علمی جوہروں کے ساتھ ایک ممتاز ادبیت اور مخصوص انشاپردازی کی حامل ہے۔ جو اپنی خصوصیات کے سبب بے حد دل آویز، نہایت دلکش اور نہایت مؤثر و نافع ثابت ہوئی ہے۔ اس پر یہ خدا کی دی ہوئی توفیق ہے کہ یہ خداداد قابلیتیں اسلامی مقاصد کی تفہیم اور ان کی ترویج و اشاعت میں صرف ہو رہی ہیں جن سے سینکڑوں اسلامی مہمات معقول پسند طبقہ کے لئے اقرب الی الفہم اور احریٰ بالقبول ہوتے جارہے ہیں۔

زیر نظر تالیف "تمدن اسلام کا پیام" مولانا کا ایک بے نظیر علمی مقالہ ہے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ کو ان کی انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کے ایک سالانہ جلسہ میں سنانے کے لئے قلمبند کیا گیا ہے۔ مقالہ کا مقصد اسکے عنوان سے ظاہر ہے۔ مقصد کا ادا کرنے والا مولانا عبدالماجد کا قلم ہے مخاطب فہیم اور معقول پسند طبقہ ہے اس لئے قدرتی طور پر مقالہ کا انداز بیان اس قدر دلکش ہو گیا ہے کہ موضوع مقالہ ("تمدن اسلام") خود اپنے منہ سے بول پڑا ہے اور اس نے مولانا کے قلم کی آڑ لیکر اپنی پوری داستان خود ہی پڑھ کر سنادی ہے قلم کی خوبی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ مضمون اپنے منہ سے بول پڑے، مولانا کے قلم نے اسے مضمون کے حال ہی سے نہیں قال سے بھی سج کر دکھلایا گویا آپ نے دنیا

کے سامنے ایک ایسا بولتا چالتا اور زندہ تمدن پیش فرمایا ہے جس نے اپنی زندگی کی شگفتگی خود اپنے منھ سے ایک ایسے انداز میں پیش کی ہے کہ دوسرے تمدنوں پر خود ایک مردنی سی چھائی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

اثنار مقالہ میں مجادلۂ حسنہ کے ساتھ غیر اسلامی معاشرتوں پر کچھ ایسی لطیف چٹکیاں لی گئی ہیں کہ چٹکی بھرنے والا ہاتھ تو نظر نہیں آتا مگر ہمارے ہی تمدنوں کے بدن پر جگہ جگہ داغ نمایاں ہوگئے ہیں اور ساتھ ہی اسلامی تمدن کے گوشہ گوشہ کی برتری اور ہمہ نہج فوقیت بھی دلائل و براہین سے ہی نہیں محسوسات و مشاہدات کی روشنی میں خوب خوب کھل گئی ہے۔

مہد سے لیکر لحد تک، عبادت سے لیکر عادت تک، شہریت سے لیکر حکومت تک، انفرادیت سے لیکر اجتماعیت تک ایک مسلمان کی پوری اسلامی زندگی اس خوبی سے پیش کردی گئی ہے کہ تمدن اسلامی کی مجسم تصویر سامنے آکھڑی ہوئی ہے اور مقالہ کے بلیغ و ہمہ گیر عنوانات یا الفاظ و کلمات کی جامعیت و دوررسی کے سبب اس تصویر کے باریک سے باریک خط و خال بھی آئینۂ الفاظ سے عیاں دکھلائی دینے لگتے ہیں، اسلامی تمدن کی بنیادیں خدا پرستی و خدا ترسی دیانت و امانت عفت و صداقت تقویٰ و طہارت اور آخر میں اس کی تاریخی عظمت و صولت ادھر غیر اسلامی معاشرتوں کی بنیادیں جاہ و باہ کی بدمستیاں، خود غرضی، لقمۂ حرام، شراب و مسکرات، زنا و نگاہ بازی، نقب زنی و ڈکیتی، جرائم کے روز افزوں اعداد و

شمار زہر خورانی، دآتش زنی، حرب وضرب اور خودکشی وغیرہ تقابل کے ساتھ ایسے انصاف سے نمایاں کردی گئی ہیں کہ اگر اسلامی تمدن کی خوبیاں منھ سے بول پڑی ہیں تو غیر اسلامی تمدنوں کی زشتیوں اور مضرتوں نے بھی اپنا پردہ اپنے ہی دہن وزبان سے چاک کردیا ہے جس سے نتیجۂ بیان میں اسلامی تمدن محبوب ترین اور مرجع عالم تمدن ثابت ہوتا ہے جس کی طرف دل خود بخود کھنچ آنے پر مجبور ہو جائے اور یہ غیر طبعی تمدن مبغوض ترین تمدن ثابت ہوتا ہے جس سے مذاق سلیم رکھنے والوں کو قے آنے لگے۔

غرض مقالہ اپنی لفظی اور معنوی خوبیوں۔ انشاء پردازی، بلاغتِ بیان، سلاستِ عنوان اور جامعیت مقصد کے لحاظ سے اسی بہترین داد وتحسین کا مستحق ہے جو مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے صاحبِ قلم کے کسی مضمون کے حصہ میں آسکتی ہے۔ اس لئے اس مقالہ کی خوبیوں کا تعارف کرانے کے لئے میرے نزدیک آخری تقریظ یا حقیقی صورت تحسین صرف یہی ہو سکتی ہے کہ اسے مولانا ممدوح کا مقالہ ہونے کی نسبت حاصل ہے، جو ہر قسم کی تقریظ وتحسین سے مستغنی اور بالاتر ہے۔

اگر ہماری اسلامی یونیورسٹی کے فاضل طلبہ اور ان کے شفیق ومربی سرپرست لمحات زندگی گذارتے وقت صرف اس مختصر مگر جامع مقالہ ہی کو سامنے رکھ لیں (جس کی آج کی فضا میں کم از کم مجھے ان کی روز بروز اُبھرنے والی صلاحیتوں کے پیشِ نظر سو فیصدی توقع ہے) تو میں سمجھتا ہوں کہ ہماری معاشرت سے وہ آلودگیاں بہت جلد زائل ہو جائیں گی، جنہوں نے ایک عرصہ دراز سے ہمارے خالص اسلامی تمدن

کو مکدر اور بدنما بنا رکھا ہے اور ہم ایک جامع تمدن و تہذیب کو سر پر رکھتے ہوئے اغیار سے تمدن کی بھیک مانگتے پھر رہے ہیں ؎

یک سبد پرنان ترا بر فرق سر
تو ہمے جوئی سب ناں در بدر

یہ ایک ہی مقالہ اگر کردار کی صورت اختیار کر لے جو سرتا سر اسلامی سنن اور معمولات نبوت کا آئینہ دار ہے تو وعدۂ نبوت کے مطابق بہت جلد عہد حاضر کی تمدنی شوکت کی مکر چاندنی کا پردہ چاک ہو کر اسلامی تمدن کی سادہ اور فطری روشنی نگاہوں میں کھپ جائے گی، مسلمانوں کی ہیئت و شوکت رفتہ لوٹ کر آج کل کی ذہنی مرعوبیت کا خاتمہ کر دے گی۔ اور پھر دور حاضر کے مسلمان محسوس کریں گے کہ وہ اپنی نگاہوں میں کیا ہو گئے اور اغیار کی نگاہوں میں کیا دکھلائی دینے لگے ہیں،

ارشاد نبوی ہے۔

من حفظ سنتی اکرمہ اللہ باربع	جس نے میرے طریقہ کا تحفظ کیا خدا تعالیٰ چار
خصال۔ المحبۃ فی قلوب البورۃ	باتوں سے اس کی عظمت قائم کر دینگے۔ پاکبازوں
والھیبۃ فی قلوب الفجرۃ والسعۃ	کے دل میں اس کی محبت ڈالدیں گے اور بدکاروں
فی الرزق والثقۃ فی الدین	کے دل میں ہیبت اور رزق کو وسیع کر دیں گے
(رواہ اہل السنن)	اور دین میں پختگی نصیب فرما دیں گے۔

ہم سب خدام اسلام کو فاضل مقالہ نگار مولانا عبدالماجد کا ممنون احسان

ہونا چاہیئے کہ انہوں نے ہمارے لئے اسلامی زندگی کے پیغام کی بروقت تجدید کی، اور عرصہ کا بھولا ہوا سبق وقت کی زبان میں ہمیں دلپذیر انداز اور حجت و برہان کی روشنی میں سمجھا دیا۔ لیهلك من هلك عن بينة ويحيٰ من حيّ عن بينه۔

وباللہ التوفیق۔

احقر

محمد طیّب غفرلہٗ

دارالعلوم دیوبند

۲۸ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ

تمدّنِ اسلام کا پیام

بیسویں صدی کی دنیا کے نام

بچے، مسلم و کافر سب ہی کے گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں مسلمان کے گھر میں اِدھر بچہ ہوا، اُدھر نہلا دُھلا، سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ گھر کے کسی بڑے بوڑھے نے، کسی نیک فرد نمازی نے آکر اس کے دونوں کانوں میں اذان و اقامت کہی، گویا اللہ کی توحید اور محمدؐ کی رسالت کا پیام، بچہ کے دنیا میں آتے ہی اُسے سنا دیا اور پھر کسی نے ایک خرما اپنے دانتوں سے کچل اور لعابِ دہن سے تر کر کے اسے ذرا سا چٹا دیا کہ یہ سنتِ رسول اسلام و ہادی انام ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ میری ہی یعنی مخصوص و خالص اسلامی تمدن کی ایک جھلک۔

بچہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا، ٹانگوں میں توانائی آئی، انگنائی میں اور باہر دوڑا دوڑا پھرنے لگا۔ زبان تلفظ پر کھلی، پڑھنے بٹھائے گئے، اور جو لفظ، جو فقرہ سب سے پہلے زبان پر لایا گیا وہ یہ نہیں کہ "الف سے انڈا" یہ نہیں کہ AFAT MANRAN بلکہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہی بسم اللہ اس کی (BASIC)

تعلیم ہے یہی اس کا کنڈر گارٹن یہی اس کا مانٹیسوری میتھڈ ——— وہی میری ایک جلوہ آرائی !

بچہ نے اب ہوش سنبھالا ۔ سیانا ہو کر اب تنہا سفر کرتا ہے ۔ ریل پر جا رہا ہے کھانے کا وقت آگیا، ناشتہ ساتھ ہے یا تازہ کھانا اسٹیشن سے خریدا، ہاتھ دھویا، رومال بچھا کھانا رکھا، درجہ میں اور بھی ہمسفر ہیں، پہلے کے ملاقاتی نہیں، اجنبی محض صاحب سلامت تک بھی نہیں لیکن ان میں سے جو مسلمان نظر آتے ہیں درخواست ان کے سامنے پیش ہو رہی ہے کہ آئیے حضرت! کھانا حاضر ہے اُدھر سے جواب ملتا ہے کہ بسم اللہ بارک اللہ، آپ نوش فرمائیں، نہ چھوت چھات کا سوال نہ ذات برادری کی پوچھ تاچھ کہ اجنبی لوگ اپنی برابر کے ہیں بھی یا نہیں اور نہ تعارف انٹروڈکشن کا انتظار ——— یہ آخر کیا ہے؟ میرا ہی ایک اور منظر، تمدن اسلام ہی کا ایک اور نمونہ۔

بچہ جوان ہوا اور شادی کے قابل لڑکے اور لڑکی دونوں کی مرضی پا لینے کے بعد ماں، باپ تاریخ نکاح مقرر کرتے ہیں۔ دلہن کے گھر پر دولھا معہ اپنی پارٹی کے آئے، ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ زنان خانہ میں دلہن۔ مردانہ میں دولھا۔ دلہن نے کسی قدر رو رو کر باضابطہ منظوری وکیل نکاح کو دو گواہوں کے سامنے دی۔ انھوں نے محفل میں آکر قاضی کے سامنے دوہرایا، قاضی نے خطبہ میں حمد و نعت پڑھی، اللہ و رسول کا کلام سنایا، آئندہ کے فرائض کو اسلام کی مقدس اور

مسلمانوں کی بین الملی زبان (عربی) میں یاد دلایا، نکاح اور اولاد کے برکات بیان کئے اور شوہر کی زبان سے مہر و قبول کا اقرار کرا کے اللہ سے زوجین کے حُسنِ معاشرت کی دعائیں مانگ، رسم نکاح خوانی کو ختم کر دیا ـــــــ شروع سے آخر تک نہ پوجا پاٹ، نہ مشرکانہ توہمات۔ وہی تمدّن اسلامی کی ایک اور نقاب کشائی۔

بچہ بوڑھا ہوا، سفرِ آخرت کی تیاریاں۔ بستر مرگ پر عزیز و قریب سب اکٹھے کوئی کلمہ پڑھ رہا ہے، کوئی سورۂ یٰسین دم کر رہا ہے، کوئی صرف اللہ اللہ سنا رہا ہے، کہ جو آواز آنکھ کھولتے ہی دنیا میں سب سے پہلے سنی تھی، دم رخصت، آنکھ بند بھی اُسی نام پر ہو۔ کوئی آب زمزم حلق میں ٹپکا رہا ہے، کوئی چارپائی قبلہ رُخ کر رہا ہے، دم آخر ہوا بھائی، بھتیجے، بیٹے، پوتے سب لگے لپٹے ہوئے ہیں۔ کوئی ہاتھ پیر برابر کر رہا ہے، کوئی پیر کے انگوٹھے اور آنکھوں پر پٹی باندھ رہا ہے، یہ ہو چکا تو غسل کا پانی نیم گرم تیار ہوا، بیر کی پتیاں ڈالی گئیں کفن کا کپڑا آیا، اُجلا اُجلا پیراہن تیار ہوا۔ طہارت، وضو، غسل، سب باقاعدہ اور ترتیب کے ساتھ عمل میں آیا۔ کلمہ کا وِرد قرآن کی آیتیں رسول کی بتائی ہوئی دعائیں برابر جاری۔ کافور جا بجا مَلا گیا کہ کل جو اعضاء حشر میں چمکیں گے، ان کی کچھ دھندلی سی جھلک تو یہیں نظر آجائے، جنازہ بن ٹھن کر قبرستان روانہ ہوا "جیسے گلشن کی آخری ہو بہار" میت غریب سے غریب کی سہی، کاندھا بڑے سے بڑا آدمی دے رہا ہے۔ قبرستان سارے بستی والوں، یا سارے محلہ والوں کا ایک، یہ نہیں کہ سویلینس کا اور ملٹری والوں کا اور

گورے اور کالے کا امتیاز مرنے کے بعد بھی قائم رہے نماز جنازہ پڑھی گئی، بوڑھے اور بچے سب نے مل کر خدائے واحد سے دعا مانگی کہ مغفرت و رحمت اس میّت کے بھی شامل حال رہے اور ہم سب کے بھی۔ میّت کو اگنی دیوتا، یا کسی اور دیوی دیوتا کے حوالہ نہیں کیا گیا، منتر کسی اور کے نام کے نہیں پڑھے گئے۔ بندہ کا ربط تمامتر و براہ راست معبود ہی کے ساتھ قایم رہا۔ قبر کے مکان میں آرام و احترام کے ساتھ اُتارا۔ قبلہ رخ کر کے لٹایا۔ اُتارتے وقت آوازیں بلند رہیں۔ بسم اللہ و باللہ وعلی ملۃ رسول اللہ زمزم و عرق کیوڑہ کی خوشبو نے مٹی کے گھر میں قصر جنت کی دلآویزی پیدا کردی۔ مکان کے دروازے پہلے لکڑی سے اور پھر مٹی سے بند ہوئے۔ ہاتھ مٹی کے ڈھیلے اُٹھا اٹھا کر ڈال رہے ہیں، اور زبان ذکر الٰہی کا زمزمہ تسکین و تسلّی سُنائی جارہی ہے کہ اس میں گھبرانے اور ڈرنے کی کون سی بات ہے (منها خلقنکم) ارے یہ پیاری مٹی تو وہی ہے جس سے سارا گوشت بنا تھا اور بنانیوالے بھی ہم ہی تھے۔ بس اُسی کی طرف تو واپس ہو رہے ہو یہ کوئی اجنبی اور نامانوس چیز تھوڑی ہی ہے، اور واپس کرنے والے بھی ہم ہی ہیں، اپنوں سے بڑھ کر اپنے کوئی غیر نہیں (وفیها نعیدکم) اور اسی سے ایک دن پھر صحیح و سالم تمہیں برآمد کریں گے اور پھر وہ بھی ہم ہی ہوں گے سابقہ کسی اور سے پڑنے والا نہیں (ومنها نخرجکم تارةً اُخریٰ) چلتے چلتے پھر میّت کے حق

ہیں دعائیں خدائے واحد سے، اور پھر قبرستان سے واپسی مسلمان کی روزانہ زندگی کے سارے مناظر پیدائش سے لے کر موت تک اپنی نگاہ کے سامنے لے آیئے، ہر جگہ آپ کو دوسری قوموں سے، دوسری ملتوں سے دوسری اُمتوں سے ایک شانِ امتیاز نظر آئے گی۔ اطوار و آداب میں، بیداری و خواب میں، وضع و لباس میں، بھوک اور پیاس میں، صبح بستر سے اٹھے گا تو ساتھ ہی کہے گا لا اِلٰہ الّا اللہ کھانے پر بیٹھے گا تو لقمہ منہ میں بعد کو رکھے گا پہلے کہے گا بسم اللہ پانی ٹھنڈا حلق سے اُتارے گا تو ساتھ ہی منہ سے نکلے گا الحمد للہ گوشت کے لئے زبان چٹخارہ لے گی، تو تلاش حلال جانور کی کرے گا، اور اسے بھی پہلے قبلہ رُخ لٹائے گا بسم اللہ اور اللہ اکبر پڑھ لے گا جب کہیں جاکر چُھری چلائے گا۔ یہ سب اگر میری ہی نشانیاں اور میری ہی جلوہ آرائیاں نہیں ہیں تو آخر کیا ہیں؟

تعارف کے بعد یاد کیجئے، اپنے ملک کے ایک زنّار دار دہریہ کا یہ تجاہل کہ ہندوستان میں اسلامی تمدّن سرے سے ہے کہاں؟ —— آفتاب کی روشنی کا روز روشن میں اس سے بڑھ کر انکار کس نے اور کب کیا ہوگا؟ میں تو جزو ہوں ہر مسلمان۔ ہاں ہندی مسلمان کی بھی زندگی کا۔ اس کی روح میں داخل، اس کی ہر سانس میں شامل!

لیکن میری حقیقت اچھی طرح سمجھ لیجئے جزو ہوں۔ کل نہیں، فرع ہوں، اصل نہیں، شعاع ہوں آفتاب نہیں، میری اصل و بنیاد جو کچھ ہے وہ دینِ اسلام ہے ـــــ دنیا کی کشت زار کے حق میں بارانِ رحمت خالق کا اپنی مخلوق پر سب سے بڑا احسان ـــــ تمدّنِ اسلام کے معنے یہ نہیں کہ کسی ملک یا زمانہ کی مسلمان آبادی نے اکٹھے ہو کر جغرافی، تاریخی، نسلی حالات کے ماتحت اپنے لئے کچھ دستور وضع کر لئے اور ان کا نام تمدّن اسلام رکھ لیا۔ تمدّنِ اسلام نام ہے اسلام کے تمدّن کا۔ مسلمانوں کے تمدّن کا نہیں۔ میں مصنوع نہیں، مخلوق ہوں، بندوں کے ذہنی اختراع کا نتیجہ نہیں، خالق کے احکام کا آئینہ بردار ہوں۔ مسیحی تمدّن، ہندو تمدّن وغیرہ کے الفاظ سے دھوکا کھا کر میرے متعلق یہ نہ فرض کر لیجئے کہ جس طرح وہ نام ہیں دوسری قوموں کے ہزارہا سالہ مجموعی تاریخی روایات کے، حکایات کے، خرافات کے، اسی طرح میں بھی پیداوار ہوں، عرب و عجم کے اختلاط کا یادگار ہوں طغرل و سنجر کے اقتدار کا! تمدّن اسلام صرف وہ تمدّن وہ طرزِ زندگی ہے جو ثابت ہے قرآن پاک سے اور سنت رسول انام ہے اور یا پھر مستنبط ہوتا ہے انہیں دونوں سے ائمہ مجتہدین و اکابر فقہا کے قواعد و اصول سے۔ یہ تصریح اس لئے ضروری ہوئی کہ کہیں تعزیہ اور علم، براق و ضریح روشنی و آتشبازی، حلوہ و ملیدہ، ڈھول اور طنبورہ، چادر اور گاگر کو بھی میرا جزو نہ سمجھ لیا جائے، حاشا میں ان سے بری، ایک بار نہیں، ہزار بار بری!

لوگوں کو یہ دھوکا یوں لگا کہ اسلام کو دوسرے مذہبوں پر قیاس کر لیا گیا، اسلام دوسرے موجودہ مذہبوں کی طرح کوئی وردی نہیں کہ اسے اتوار کے دن گرجا جاتے ہوئے یا صبح و شام مندر میں پوجا کے لئے جاتے وقت جسم پر ڈال لیا اور واپسی میں اتار کر ٹانگ دیا اور پھر ہر معاملہ میں آزاد اور بے فکر اور مطلق العنان جو چاہا کھایا پیا، جس طرح چاہا رہے سہے، جس سے چاہا ملے جلے ــــــ یہاں تو قدم قدم پر پہرا بیٹھا ہوا تھا آزادیوں کا دامن ہر طرف سے سلا ہوا۔ جانور فلاں حرام اور فلاں حلال۔ حلال کو بھی ذبیحہ کے طریق پر اپنے لئے حلال کیجئے، ورنہ اس کے ذائقہ سے بھی محروم رہیئے۔ شراب نہ پیجئے۔ افیون سے شوق نہ کیجئے۔ بھنگ بوٹی سے دور ہی کی آشنائی رکھیئے، سودی کاروبار کے پاس نہ پھٹکیئے، ساہوکارہ کھول کر گھر بھر لینے کا خیال بھی دل میں نہ بسایئے۔ دلی چاوڑی بازار یا لکھنؤ چوک سے گزرنا ہو تو کوٹھوں کی طرف آنکھ نہ اٹھایئے۔ مرد ریشم سے اپنے جسموں کو زینت نہ دیں۔ عورتیں اپنی زیبائش جمال کی چھاؤں بھی نامحرموں پر نہ پڑنے دیں۔ گھر میں بچہ پیدا ہوا تو یہ نہ ہو کہ خوشی میں آ کر لگے ڈھول پر ڈھول ٹوٹنے، اور طبلہ سارنگی کی آواز سے فضا گونجنے، اور کوئی عزیز چل بسے تو یہ نہ ہو کہ افراط غم میں شروع ہو جائیں شریعت کی زنجیریں ٹوٹنی غرض زندگی کا کوئی شعبہ، بڑا یا چھوٹا ایسا نہیں جس میں دینِ فطرت نے انسانی ہوا و ہوس کو آزاد و بے قید چھوڑ دیا ہو، اور اس کی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کو طرح طرح کی ہدایات سے

جکڑ نہ دیا ہو ـــــ ٹھیک اس حکیم حاذق کی طرح جو مریض کو کھانے، پینے، سونے، جاگنے، چلنے پھرنے، دوا دوش ہر ہر جزیہ کی رعایت اپنے دستور العمل میں رکھے ہوئے ہے، اور ایک مکمل پروگرام چوبیسوں گھنٹوں کا آپ کے ہاتھوں میں دے چکا ہے۔

عقائد کے بعد، اس جامع مفصل کامل و مکمل نظام عمل کے جتنے جزو کا تعلق براہ راست خالق سے ہے اُس کا نام سہولت کے لئے عبادت پڑ گیا اور نماز، روزہ، حج وغیرہ اس کی قسمیں قرار پائیں، باقی جن اجزا کا تعلق بندوں کے باہمی میل جول، لین دین، صلح و جنگ، کھیل کود سے ہے، ان کے مجموعہ کا نام ہے تمدن اسلام یا معاشرت اسلامی، اور یہی میں ہوں ـــــ میں پکار کر کہتا ہوں کہ دنیا بھوک سے تڑپ رہی ہے اور میں ہوں اس کے لئے ایک طاقت بخش غذا۔ دنیا درد سے لوٹ رہی ہے اور میں ہوں اس کے حق میں نسخہ شفا۔ پریشانیاں جو کچھ بھی چھائی ہوئی ہیں سب اس لئے کہ مجھے چھوڑ رکھا ہے۔ مصیبتیں جتنی بھی آئی ہوئی ہیں سب اس لئے کہ مجھ سے مُنہ موڑ رکھا ہے۔ یہ دعوے کا اعلان ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ پیام پہونچ جائے بیسویں صدی کی زار و نزار لاغر و بیمار دنیا کے کان تک میرے فرزندوں کے ذریعہ سے علی گڑھ کے جگر گوشوں کے وسیلے سے۔

دنیا آج نشہ بازی کی جن لعنتوں میں گرفتار ہے، اس کی داستان دُہرانے کے لئے بھی وقت چاہئے، افیون چانڈو، مدک، کوکین، ہیروئن اور سب سے بڑھکر

شراب۔ دنیا کی دولت کا اربوں روپیہ انہیں پر صرف ہو رہا ہے اور پھر بیماریاں اور جرائم جو اُن سے پھیل رہے ہیں، انکا شمار ہی نہیں۔ لیگ آف نیشنس کنونشن پر کنونشن تیار کرتی چلی جاتی ہے، کمیشن پر کمیشن بٹھاتی چلی جاتی ہے۔ مختلف حکومتیں امتناع (پروہبیشن) کے قانون پر قانون بناتی چلی جاتی ہیں اور دنیا کے بڑے مدبّرین کی عقلیں چرخ ہو ہو گئیں ہیں ——— میں جب زندہ و توانا تھا میرے عہدِ شباب میں بھی کوئی دشواری اس قسم کی پیش آئی تھی؟ شراب تو عرب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، بے اس کے ان کے نزدیک جینا محال تھا، پھر محمدؐ رسول اللہ کے زمانہ میں کتنے شرابی حجاز میں، نجد میں، یمن میں، سارے ملک عرب میں باقی رہ گئے تھے؟ عمر فاروقؓ کے زمانے میں عراق، ایران، خراسان، حلب، دمشق، مصر، سب میرے زیرِ نگیں آ چکے تھے۔ اس سارے عرب ایمپائر میں کتنے افیونی تھے، کتنے شرابی؟ جواب دل کی عقیدت سے نہیں، تاریخ کے اوراق سے حاصل کیجئے۔ تاریخ بھی شبلی نعمانی اور سلیمان ندوی کی لکھی ہوئی نہیں، اُن کے قلم سے نکلی ہوئی جن کی زندگی کا مشن ہی اسلام، تاریخ اسلام کو سیاہ کر کے دکھانا ہے! ہمارے ہاں بھی کوئی تیوہار، کوئی مقدس گھڑی ایسی آتی ہے کہ شراب کا چھونا، چکھنا، پینا، جسم پر لگانا بطور شگون ضروری ہو؟

میرے بچے بھی "یوکرسٹ" اور ہولی کے تقدس سے واقف ہیں، امتناع

کے قوانین نافذ کرکے دنیا میری ہی ناقص اور ناتمام نقالی کی طرف آرہی ہے یا نہیں؟

نشہ اور جوئے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عرب تہذیب جاہلی جس طرح شراب کی متوالی تھی، جوئے کی بھی دیوانی تھی، اور آج کی مہذب قوموں کی زندگی میں تو جوا طرح طرح کے ناموں اور خوشنما و نظر فریب اصطلاحوں کے ساتھ رگ ریشہ میں پیوست ہوگیا ہے، لاٹری اور انشورنس اور گھوڑ دوڑ میں بازی اور فٹ بال میں بازی اور کارنیوال اور لکی بیگ اور کراس ورڈ پزل (الفاظ کے معمے) وغیرہ وغیرہ مجنونوں اور امراض دماغی کے مریضوں کی کتنی تعداد ہر سال یہی خوش اعمالیاں بڑھا رہی ہیں (واقعات خودکشی کے اسباب، کس کثرت سے بالآخر نشہ اور قمار ہی پر ختم ہوتے ہیں) ــــــ میرے زمانہ عروج و اقبال کی تاریخ پڑھ جائیے، اس عہد میں بھی کوئی مشہور جواری ملے گا! قمار کی عزت کسی نام کے ساتھ اور کسی پردہ میں نظر آتے گی، میرے دور میں بھی کہیں اس کی نظیر ملے گی کہ فلاں عظیم الشان راجہ اپنے بھائیوں سمیت اپنا راج پاٹ، بلکہ اپنی عزت و ناموس تک جوئے میں ہار بیٹھے اور آخر جلا وطنی پر مجبور ہوئے؟ میرے عہد میں بھی راجہ نل بطور ہیرو کے نظر آئیں گے؟ میرے ہاں بھی دستور رہا ہے کہ نوروز یوں منایا جائے کہ لکشمی دیوی کی پوجا کے ساتھ جوئے کو بھی جزو عبادت بنالیا جائے اور قانون تعزیرات ہند تک کو دو تین دن کے لئے جوئے کی آزادی دینی پڑے؟ میرے دور میں بھی کسی مانٹ کارلو کی شہرت چمکی ہے؟ میرے ہاں بھی کہیں ایسا ہوا ہے کہ کسی

علاقہ کی آمدنی کا بڑا حصہ جوئے ہی کی رقم سے آتا ہو؟ اُس وقت بھی کسی شہر سے متعلق یہ تصریح آپ کو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں نظر پڑتی ہے کہ وہاں کے جُوئے کی آمدنی کا ٹھیکہ فلاں کمپنی نے لیا ہے اور وہ ہر سال حکومت کو ۹۰،۹۰ ہزار، یا ایک ایک لاکھ پونڈ دیتی رہتی ہے! ۱۳، ۱۳ لاکھ روپیہ سالانہ جب کمپنی کے کمیشن کا ایک حصہ ہوا تو اس بے انداز دولت کا جو جُواریوں کی جیبوں میں اُدل بدل کرتی رہتی ہے کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟ انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ قمار بازی کی بندش ہو کیونکر اس کی عمر تو تاریخ انسانیت کے دامن سے وابستہ ہے، بے شک یورپ کی تحقیق میں ایسا ہی ہوگا، کاش اس کلیہ سے تمدنِ اسلام کو مستثنیٰ کر دیا ہوتا!

خوشی کی تقریبات سبھی قومیں مناتی ہیں لیکن یہ جشنِ قومی کے موقع عموماً شرافت، متانت وعصمت کے مقتل ہی ہوتے ہیں، دوسری قوموں اور مذہبوں کی تاریخیں اٹھا کر پڑھ لیجئے اور کتب بینی کی فرصت نہ ہو تو اپنی آنکھوں ہی سے گردو پیش کی قوموں کا حال ملاحظہ فرما لیا جائے۔

سال میں دو جشن میرے ہاں بھی آتے ہیں، ایک عید، دوسرے عید الضحیٰ اور اسی کو عرفِ عام میں بقر عید کہتے ہیں، دونوں موقعوں پر خوشی اتنی ہوتی ہے کہ اس کے اظہار کے لئے عید کا نام ہی ضرب المثل بن گیا ہے، لیکن اس بے انداز

خوشی کے ساتھ، بدمستی اور بیخودی کہیں آس پاس بھی آنے پاتی ہے، یہاں یہ نہیں ہوتا کہ ہزارہا مرد ہر عمر اور ہر طبیعت کے اور ہزارہا عورتیں ہر سن و سال کی دریا میں مخلوط غسل کے وہ وہ منظارے پیش کریں کہ خود بے حیائی کی نگاہیں نیچی ہو ہو جائیں یہ بھی نہیں ہو پاتا کہ ہزارہا کے مجمع پر (HOLIDAY MOOD) کی وہ بدمستی طاری ہو کہ پولیس کے سارے انتظامات اور ضبط و انضباط کی ساری بیجا شہرت کے باوجود بیسیوں لاشیں نکلیں، اور پچاسوں زخمیوں کے لئے ایمبولنس کار کی خدمات کی ضرورت پڑ جائے (امریکہ اور یورپ کے ہر میلے ٹھیلے کی رپورٹ انگریزی اخبارات میں پڑھ دیکھئے) یہاں ہوتا ہے تو یہ کہ عید سے لطف اٹھانے کے لئے پہلے مہینے بھر کے مسلسل روزے رکھیے، صبح سے شام تک دانا پانی اپنے اوپر حرام کر لیجئے، جب کہیں جا کر عید کا چاند نظر آئے گا، اُس وقت اس عبادت کا شکر یوں عبادت ہی کی صورت میں منا یئے کہ روز صبح اٹھ کر وضو کرتے تھے آج غسل کیجئے روز نماز پانچ وقت کی پڑھتے، آج چھ وقت کی پڑھیئے۔ دن نکلنے کے بعد ذرا اچھا سا لباس پہن گھر سے باہر عید گاہ کے قصد سے نکلئے اور وہاں پہونچکر سب کے ساتھ مل کر نماز پڑھیئے اور خطبہ سنیئے اور اس کے قبل ہی کچھ خیر خیرات کر ڈالئے اور دن بھر دوست احباب، عزیز آشناؤں سے ملتے رہیئے۔ جس عید کی اتنی دھوم مچی ہوئی ہے، یہ ہے اس کی کل کائنات! بقر عید میں بجائے نقد و جنس کی خیرات کے بعد نماز، حسب مقدور جانوروں کی قربانی پیش کیجئے۔ عید گاہ جاتے

آتے، دونوں عیدوں کے موقع پر کسی مائی ماتا دیوی، دیوتا کی جے پکارتے نہیں باآواز بلند ذکر الٰہی کرتے رہے۔

کیا میرے ہاں کبھی بندروں کے چہرے لگانے پڑتے ہیں؟ میرے ہاں کبھی جسم پر راکھ اور بھبھوت مل، طرح طرح کے روپ بھرنے پڑتے ہیں؟ میرے ہاں کبھی ماؤں اور بہنوں اور بیٹیوں کے سامنے گندے سے گندے گیت گانے ہوتے ہیں؟ میرے ہاں کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس نے مارے پچکاریوں کے اس کی شکل بگاڑ دی، اور اُس نے اتنا رنگا کہ انسان کے بجائے انسان کا "کیری کیچر" بنا دیا؟ ــــ مینوں میں بھی اتنا ہوش، سوا میرے دامن کے اور کس کے سایہ میں ملے گا؟ کھیل کود میں بھی اتنی صفائی اور ستھرائی! اس لطافت کی، اس نفاست کی، اس نظافت کی مثال اور کہیں ملے گی؟

کوئی نسبت بھی ان آنکھوں سے ہے پیمانہ کو؟

ہمسایہ قوموں میں اپنے اپنے تیوہاروں کو "پوتر" یعنی پاک وصاف بنانے کی جو تحریکیں شروع ہوئی ہیں یہ سب اگر میرا فیض نہیں تو اور کیا ہے؟

حاکم اور محکوم کے باہمی تعلق کے اندازہ میں دنیا اب تک کیسی کیسی خونریز غلط فہمیوں کا شکار رہی ہے! اور آج تک انہیں غلط فہمیوں پر اصرار ہے۔ کوئی روس کی سوویٹ کے بت کا پجاری ہے، اور کسی کا عقیدہ ہے کہ فلاح قوم ونجات

ملک نازیت یا فاسطیت سے وابستہ ہے اور کسی نے اپنی لوٹ ڈیما کریسی (عمومیت) سے لگا رکھی ہے اور پھر ان میں سے ہر ایک عقیدہ کے "پرچار" (اشاعت) کے لئے دلائل استعمال ہو رہے ہیں، توپ اور مشین گن، بم اور گیس کے، میں نے اپنی طاقت کے وقت بتایا، اور بتایا کیا صاف صاف راستہ دکھایا کہ یہ ساری غلط فہمیاں شاخ ہیں ایک اساسی غلط فہمی، یعنی مقصد حکومت کی گمراہی کی جڑ یہی ہے، انسان نے حاکم اپنے کو سمجھ لیا، اور قوی کمزور پر، زبردست زیردست پر حکمراں ہو بیٹھا۔ میں نے علی الاعلان کہا کہ حکومت تو صرف اللہ کی ہے (ان الحکم الا للہ) بشر بشر پر حاکم کیسے ہو سکتا ہے۔ البتہ بشر کا کا کام خلافت الٰہی، نیابت الٰہی، قوانین الٰہی کا نفاذ ہے۔ قانون ساز وہ نہیں قانون ساز تو کوئی اور ہے۔ بشر کا کام الٰہی قاعدوں اور ربانی ضابطوں کو دنیا میں صرف چلانا، پھیلانا ہے۔ کانسٹی ٹیوشن (آئین ودستور) والی ساری دشواریاں اس ایک نکتہ سے کافور ہو گئیں۔ اب میرے سامنے یہ سوال ہی نہ رہا کہ کانسٹی ٹیوشن کیا ہو۔ سوال صرف یہ رہ گیا کہ اس کے چلانے والے کون ہوں؟ وہ ہوں۔ جو متدین ہوں، جو صاحبِ ضمیر ہوں، کیرکٹر والے ہوں، امین ہوں، متقی ہوں، اپنے اعمال واقوال کے ذمہ دار وجواب دہ، مخلوق کے سامنے نہیں، خالق کے سامنے ہوں اور فاروق وصدیق کی حکومتوں نے دکھلا دیا کہ بغیر انسانی دماغوں کے تیار کئے ہوئے کاغذی طومار کے بغیر لکھو کھا روپیہ کی اسمبلی اور کونسل کی عمارتوں

کے بغیر کونسلوں میں لامتناہی سلسلۂ سوال و جواب کے بغیر منسٹروں، سکریٹریوں، پارلیمنٹری سکریٹریوں کی وساطت، اور بغیر سکریٹریٹ کی انبوہ در انبوہ فوج کے، روئے زمین پر عدل کی حکومت کس طرح قائم ہو سکتی ہے۔

زن و مرد کا باہمی رشتہ اور تعلق سمجھنے میں دنیا نے شروع سے اب تک کتنی ٹھوکریں کھائی ہیں اور برابر کھاتی جا رہی ہے۔ کسی نے کہا، عورت مرد سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اور اس کی پرستش شروع کر دی، کسی نے کہا مرد مالک ہے اور اس نے عورت کو باندی سے بدتر کر رکھا اور کوئی بولا کہ دونوں بالکل مساوی ہیں، اور لئے قاعدہ قانون کی بنیاد اس نظریہ مساوات پر رکھنی چاہی، میں نے اپنے دور میں ان ساری بے اعتدالیوں سے ہٹ کر عین منشائے فطرت کے مطابق فیصلہ یہ کیا کہ بلحاظ اصل و خلقت دونوں ایک ہی ہیں (خَلَقَکُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً) بلحاظ عمل دونوں کے مرتبے آخرت میں یکساں ہوں گے (لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثیٰ اور للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن) میرے ہاں یہ بحث کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی کہ آیا عورت بھی ذی روح ہے؟ اور نہ میرے ہاں کبھی دینی مقتداؤں کی کونسل نے جمع ہو کر اس سوال کا جواب نفی میں دیا اور نہ میرے ہاں یہ عقیدہ رہا کہ عورت اور شیطان ہم جنس ہیں بلکہ میں نے تو یہ کہا کہ علاوہ آخرت کے دنیا میں بھی جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے، عورت مرد میں کوئی فرق نہیں، بیویوں پر جس طرح شوہروں کی خدمت لازمی ہے، اسی طرح شوہروں پر بھی بیویوں کی

دلجوئی فرض ہے (وَلھنَّ مثل الذی علیھنَّ)لیکن اس کے آگے جہاں انسانیت کا اشتراک ختم ہوتا ہے، صنفیت کا امتیاز شروع ہوتا ہے اور اگر یہ امتیاز نہ ہو تو پھر دونوں صنفوں کی تفریق کے معنی ہی کیا رہتے ہیں؟) اس امتیاز میں انتظامی حیثیت سے مرد کو عورت پر افسری اور بالادستی حاصل ہے (للرجال علیھن درجۃٌ) کفالت، خبرگیری، بیرونی جدوجہد کے فرائض صنف قوی، مرد کے ذمہ عائد ہوتے ہیں (الرجال قوامون علی النساء) اور اسی مناسبت سے اسے قویٰ بھی عطا کئے گئے ہیں۔عورت کے ذمہ دوسری قسم کی یعنی اہلی دخانگی ذمہ داریاں ہیں، بچوں کی پیدائش، پرورش، ان کی سیرت سازی وغیرہ اور سب سے بڑھ کر مرد کی نظر میں مرغوبیت۔ محبوبیت (ازواجاً لتسکنوا الیھا وَجَعَل بَیْنَکم مَوَدَّۃً ورَحْمَۃً) اور اسی لئے اسے دوسری قسم کے آلات وقویٰ سے مسلح کر کے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔اب اس قدرتی تفریق، امتیاز کو بھی اگر کوئی شخص خلاف عدل سمجھے تو یہ اعتراض بالکل اُسی درجہ کا ہوگا جیسے کوئی یہ کہے کہ خاتم النبیین عرب میں کیوں پیدا ہوئے، ہندوستان اور جاپان کو اس دولت سے کیوں محروم رکھا گیا؟ یا فلاں ملک کے باشندے گورے کیوں بنائے گئے اور فلاں ملک کے کالے کیوں؟ (ولا تتمنوا بما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض)

میرے ہاں کے سارے قوانین نکاح، طلاق، عدت، خلع، تعدد ازدواج وغیرہ انہیں بنیادی اور فطری حقیقتوں پر مبنی ہیں اور آج دنیا کے سارے اگلے اور

پچھلے قانون سازوں کو مشرق اور مغرب کی ساری پارلیمنٹوں، قانونی کونسلوں کو لیجسلیٹو اسمبلی کو چیلنج پر چیلنج دے رہے ہیں کہ دکھاؤ کوئی نظام قانون اتنا جامع. ایسا ہر پہلو کی رعایت رکھنے والا، ایسا ہر مصلحت پر شامل (فاتوابسورة من مثله) رومی مشرکوں اور متاخر یونانیوں نے طلاق کا دروازہ کھولا، تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک ایک رومی خاتون کے لئے آٹھ آٹھ دس دس شوہروں کی شمع خلوت روشن، کھنا معمولی سی بات بن گئی، اور بعض نے تو اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ترقی کر دکھائی۔ لیکی کی ہسٹری آف یورپین مارس" (تاریخ اخلاق یورپ) اور وسٹر مارک کی" ہسٹری آف میرج" (تاریخ نکاح) ذرا پڑھ کے تو دیکھئے۔ ادھر مسیحی کلیسا نے حضرت مسیح کی تعلیم کو مسخ کر کے وقوع طلاق پر بالکل مہر ہی لگادی، نتیجہ یہ ہوا کہ فحش اور بدچلنی کے گرد جو بند باندھ دیا گیا تھا، وہ ٹوٹا اور سیلاب پوری ہلاکت خیزیوں کے ساتھ بڑھا، خود آج امریکہ اور یورپ کی عدالتوں میں مقدمات طلاق کی کیسی گرم بازاری ہے۔ اخبارات میں ان کی رپورٹیں ملاحظہ فرمائیے مشرق کی بدنام حرم سرا کی خلوتوں کا جواب کئی گنی کثرت کے ساتھ، مغرب کی نیک نام عدالتوں کی جلوتیں مہیا کر رہی ہیں یا نہیں؟ اسی طرح ہندوستان کے ہندی اور ہندو تمدن نے اس دروازہ پر قفل چڑھائے رکھنے کی صدیوں تک ناکام کوشش کر دیکھی اور اب آخر کار ہر طرف سے تھک ہار کر ہر تدبیر سے عاجز آکر، برطانیہ اور فرانس، جرمن اور اٹلی امریکہ اور ہندوستان سب کہیں کے مصلحین اور مقننین،

اسی نقطۂ اعتدال کی طرف آرہے ہیں یا نہیں جو میں مدتوں پیشتر مقرر کر چکا ہوں؟ یعنی طلاق کی اجازت خاص خاص قیود اور شرائط کے ساتھ۔ گو اب بھی اپنی کج رائی و خود رائی پر اعتماد کر کے اور مجھ سے بے نیاز رہ کر طرح طرح کی ٹھوکریں کھائی جاتی ہیں۔

میں نے جس طرح طلاق کو عین فطرت بشری و احوال انسانی کے مطابق چند قیود و شرائط کے ساتھ محدود کر کے روا رکھا ہے، اُسی طرح مرد کے لئے بھی چار شادیوں کی اجازت" اس کی ضرورتوں، مصلحتوں، سہولتوں کی رعایت، نیز ملک و قوم کے عرف عام کا اعتبار کر کے دی ہے اور علاوہ عدل کے، طلاق ہو یا تعدد ازدواج، بطور قاعدۂ کلیہ، حسن معاشرت کی قید ہر جگہ لازمی رکھی ہے (دعاشرو ھنّ بالمعروف) ایسی کسی صورت کی گنجایش میں نے نہیں رکھی کہ عورت پر خواہ مخواہ ظلم ہو، ہندیوں نے مدتوں ایک بیاہتا بیوی کے ہوتے دوسری بیوی کا نام لیتے کانوں پر ہاتھ دھرے فرنگیوں نے "پالیگمی" کا تلفظ کر کر کے خوب خوب ٹھٹھے لگائے لیکن حقائق و واقعات کی ٹھوس دنیا نہ تبرّی و تحاشی کے نعروں سے پگھل سکتی ہے نہ تالیوں اور قہقہوں سے اب (THE CASE FOR POLYGAMY) کے نام سے خاص لندن میں بیٹھ کر کتابیں لکھی جاتی ہیں اور طنز و تعریض کے نعروں میں بھی اب نہ وہ بلند آہنگی باقی رہ گئی ہے، نہ وہ جوش و خروش۔ صنفیات کے وہ نئے نئے پیچیدار مسائل جنہوں نے برنارڈ شا اور برٹرینڈ رسل جیسے

فلسفیوں اور مفکروں سے لیکر ادنیٰ اخبار نویسوں تک کو غلطاں و پیچاں، حیراں و سرگرداں کر رکھا ہے کبھی میرے دور عروج میں بھی پیدا ہوئے تھے ؟ (WHITE SLAVE TRAFFIC) کی الجھنیں سنبھالنے والی بیسیوں کمیشنوں اور کمیشنوں کے بعد بھی قائم رہ جانے والی الجھنیں، کبھی اس وقت بھی نمودار ہوئی تھیں ؟ برتھ کنٹرول اور کنٹراسپشن کی عالمگیر ہنگامہ خیزی، گو خود یورپ و امریکہ میں ذلت و نامرادی کا منہ دیکھ رہی ہے لیکن مس رابرٹ سینگر اور مس میریا اسٹوپس کے بے پناہ پروپیگنڈہ کی سلامتی میں خود ہندوستان کے ایک ایک اسکول تک پہونچ چکی ہے مگر جن ممالک میں میرا آج بھی تھوڑا بہت اثر باقی ہے نجد و حجاز و مراقش وغیرہ وہاں کوئی خواب بھی اس کا دیکھ سکتا ہے ؟ پیشہ ور (پروفیشنل) اور شوقیہ (امیچور) پراسٹیٹیوشن کے یہ اعداد (ملاحظہ ہو اسکاٹ کی ہسٹری آف پراسٹیٹیوشن) بن بیاہی ماؤں کی یہ افراط ناجائز ولادتوں کا یہ انبار آج بھی کہاں ہے ؟ ماسکو اور نیویارک، لندن اور پیرس کے جگمگاتے ہوئے ہوٹلوں، پارکوں اور ایوانوں میں یا اُن ملکوں اور شہروں میں جہاں اب بھی میرے کچھ ٹوٹے پھوٹے آثار پائے چلے جا رہے ہیں ؟

"انقلاب زندہ باد" کا نعرہ آج بچہ بچہ لگاتا ہے۔ کبھی آپ نے اُس شخص کی بھی سیرت پر نظر کی ہے جو دنیا میں ایک مستقل مستمر انقلاب — PERPETUAL REVOLUTION) پھیلا گیا ؟ اور جس کا پیدا کیا ہوا "انقلاب" عقائد عبادات،

معاملات ۔ اخلاق ، معاشرت ، ہر شعبۂ حیات میں آج بھی ساری دنیا کے مقابلہ میں ایک چیلنج ہے اور قیامت تک رہے گا ۔ آیئے اس کی ایک ہلکی سی جھلک مولانا شبلیؒ کی سیرۃ النبی کی وساطت سے دیکھتے چلیں ۔

" گھر کا سارا کام کاج خود کرتے کپڑوں میں پیوند اپنے ہاتھ سے لگا لیتے ، گھر میں جھاڑو خود دے دیتے ۔ بکریوں کا دودھ اپنے ہاتھ سے دوہ لیتے ۔ بازار سے سودا خود جا کر لاتے ۔ جوتا پھٹ جاتا تو اسے ٹانک لیتے ۔ غلاموں کے ساتھ مسکینوں کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے ان کے ساتھ کھانا کھانے میں کسی قسم کا تکلف نہ تھا ، گدھے کی سواری سے عار نہ تھا ، ایک بار مکان سے باہر تشریف لائے ، لوگ تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے فرمایا ، یہ اہل عجم کی طرح بار بار تعظیم کے لئے اٹھنا کیا معنی ؟

صحابہؓ جانیں فدا کرنے کو تیار رہتے تھے ، ہر بڑی سے بڑی خدمت اور اس کی راہ میں بڑی سے بڑی مشقت اپنے لئے باعث فخر و سعادت سمجھتے تھے اس پر بھی یہ حال تھا کہ جب وہ کوئی کام کرنے لگتے تو آپ بھی ان کے شریک ہو جاتے اور مزدوروں کی طرح کام انجام دینے لگتے ۔ مدینہ میں جب مسجد نبوی تیار ہونے لگی تو دست مبارک سے اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے اور جاں نثار خدام کی جماعت

یہ کہتی ہی رہ جاتی کہ ہماری جانیں آپ پر قربان، یہ آپ کیا کر رہے
ہیں؟ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب صحابہ، شہر مدینہ کے گرد خندق
کھود رہے تھے۔ آپ نے بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح کام شروع
کر دیا۔ یہاں تک کہ جسم مبارک پر خاک کی تہہ جم گئی۔ غزوۂ بدر میں
سواریاں بہت کم تھیں۔ تین تین آدمیوں کے درمیان ایک ایک
اونٹ پڑتا تھا آپ بھی عام آدمیوں کی طرح ایک اونٹ میں دو
اور شخصوں کے ساتھ شریک رہے اور خدام و جاں نثاران اپنی باری
پیش ہی کرتے رہ گئے۔" (سیرۃ النبی جلد ۲ ص ۲۲۷ ملخصاً)

کوئی دو چار دس پانچ واقعات ہوں تو انہیں گن کر بیان کر دیا جائے، اُسی
مقدس ہستی کی مقدس زندگی تو لبریز انہیں واقعات سے ہے، کوئی پوری سیرت
نبوی اس مختصر صحبت میں کیسے سُنا ڈالے، یہ نمونہ اس ذات نے پیش کیا جو نبوت و
رسالت کے روحانی مراتب سے قطع نظر بہر حال اپنی قوم کا بڑا دنیوی سردار بھی تو
تھا۔ آج دنیا کے ڈکٹیٹروں (آمروں) کو چھوڑیئے، بادشاہوں اور تاجداروں کو
بھی الگ کیجئے۔ رئیسوں اور امیروں کا جو برتاؤ اپنی رعایا کے ساتھ، اور افسروں کا
جو معاملہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ رہتا ہے۔ ان سب کو بھی جانے دیجئے۔ جو صاحب
جلسوں میں تھوڑی دیر کے لئے صدر منتخب ہو جاتے ہیں خود ان کا رویہ والنٹیروں
(رضاکاروں) کے ساتھ کیا رہتا ہے؟

ایک نمونہ زندگی کا وہ تھا، ایک یہ ہے، اس نمونہ کے بعد کہیں بھی بالشویزم کا، انارکزم کا، بغاوت کا، ہڑتال کا وجود باقی رہ سکتا ہے؟

دو واقعات ملتے جلتے، میرے عہد زریں کے اور سنتے چلیئے۔

غزوۂ تبوک میں سامان رسد کی کمی پڑ گئی، اور صحابہ بھوک سے نہایت درجہ پریشان ہوئے، خیال ہوا کہ اونٹ ذبح کئے جائیں، اس پر جرح یہ ہوئی کہ معرکۂ جنگ میں سواریاں بھی تو اہم چیزیں ہیں، بالآخر آپ نے یہ کیا کہ ہر شخص کے پاس سے اس کا بچا ہوا سامان رسد طلب فرمایا کوئی کم لایا کوئی زیادہ ایک چادر پر اکٹھا کر کے آپ نے اس پر دعائے برکت فرمائی، اور پھر سب سے کہا کہ اپنے اپنے برتن اس مجموعہ سے بھر لیں راویوں کا بیان ہے کہ سب نے اپنے اپنے برتن بھر لئے اور خوب سیر ہو کر کھایا، اور سامان پھر بھی بچ رہا، اسی طرح ایک اور سفر میں جب آپ نے سامان رسد میں نمایاں کمی، اور صحابہ میں بھوک کی بیتابی دیکھی تو زاد راہ ایک چادر پر ڈھیر کرا لیا۔ اُس نے کل اتنی جگہ گھیری کہ اس پر ایک بکری بیٹھ سکے اور اشخاص کی تعداد ۱۴۰۰ لیکن اس پر بھی سب لوگوں نے سیر ہو کر کھا لیا اور اپنے اپنے توشہ دان بھر لئے۔ (سیرۃ النبی جلد ۳ ص ۲۴۸ ملخصاً)

محدثین نے تو ان واقعات کو کتاب الایمان وغیرہ کے ماتحت درج کیا ہے

اور انہیں معجزات نبوی میں شمار کیا ہے، معجزہ تو نبی کی ایک ایک بات تھی، لیکن میں کہتا ہوں کہ صحیح کمیونزم کی مثال ان واقعات سے کہیں بڑھ کر ملے گی؟ پھر اسی کے ساتھ اس تاریخی حقیقت کو بھی ملا لیجئے کہ ریاست حجاز، بلکہ سارے ملک عرب کے اس فرماں روا کا عام سامان معیشت کیا تھا؟ رہنے کے لئے صرف معمولی حجرہ! بادشاہوں کے محل اور رئیسوں اور امیروں کی کوٹھیاں الگ رہیں، ان کے ایک بڑے کمرہ سے بھی چھوٹا حجرہ! نہ کوئی الگ بڈ روم، نہ ڈرائنگ روم، نہ ڈائننگ روم، اسی حجرہ کے اندر سارا انتظام خانہ داری، اور اُس کا فرنیچر؟ محض کھجور کی کھُرّی چٹائی، جس پر لیٹنے سے جسم مبارک پر بدھیاں پڑ پڑ جاتی تھیں، کوچ اور صوفے نہ سہی، روم کے پُر لطف اور ایران کے ریشمی قالین تو ہوتے! اور خیر یہ تو عہد سرتا پا خیر و برکت اور سرتا سر تقدس تھا ہی، صدیقؓ و فاروقؓ کے راستہ سے ہوتے ہوئے عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں آیئے، کہ وہ تو ایک بادشاہ تھے، اور بادشاہ بھی خاندان بنو اُمیہ کے، وہاں بھی تاریخ کی زبان آپ کو یہ واقعات سُنائیگی کہ،

"خلیفہ ہونے کے بعد جب شاہی سواریاں آئیں تو ان کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میرا خچر میرے لئے کافی ہے سوار ہو کر چلے نوکوتوال نے برچھا لے کر آگے آگے چلنا چاہا اس کو یہ کہہ کر ہٹا دیا کہ میں بھی عام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں۔ قصر

خلافت میں داخل ہوئے، تو تمام پردوں کو چاک کرادیا اور خلیفہ کے لئے جو فرش بچھایا جاتا تھا، اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت بیت المال میں داخل کردی۔

"ایک بار ایک لونڈی پنکھا جھل رہی تھی، کہ اس حالت میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ انہوں نے خود پنکھا لے لیا اور خود اس کو جھلنے لگے۔ وہ جاگی تو بولے کہ تو بھی میری طرح آدمی ہے تجھے بھی میری طرح گرمی معلوم ہوئی، میں نے چاہا کہ جس طرح تُو نے مجھے پنکھا جھلا ہے میں بھی تجھے پنکھا جھل دوں۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز صفحہ ۶۰-۶۳)

یہ سب میرا ہی تو بڑتو تھا، اور آگے چلیے، تاریخ اسلام کی چھ صدیوں کا سفر طے کر کے ساتویں صدی ہجری کے ہندوستان میں آجائیے۔ اُس وقت دلّی کے تخت پر سلطان ناصرالدین محمود نظر آئیں گے۔ تاریخ کی زبان ان کے حق میں یوں گویا ہے۔

نفقۂ خاصۂ خود را از وجہ کتابت مصحف مجید ساختہ روزگار خود می گزرانید و اموال پادشاہی را در نفقۂ خود اصلا صرف نمی نمود۔	قرآن مجید کی کتابت کر کے اسی کو وجہ معاش بناتے اور شاہی مال و دولت سے ہرگز اپنا ذاتی خرچ نہ چلاتے۔

(تاریخ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۷۱ نولکشوری)

اور پھر تصریح ہے کہ ایک بار ایک امیر سلطنت نے بادشاہ کا خط پہچان کر ان کے مکتوب قرآن کو گراں معاوضہ پر لے لیا تھا ، اس کی خبر سلطان کو ہوگئی تو ناخوش ہوئے اور حکم دیا کہ آئندہ میرا لکھا قرآن بازاری نرخ پر، بالکل خفیہ ہدیہ ہوا کرے۔

میرے عہد میں ممکن نہیں کہ کوئی بیوہ ۔ بڑھیا ، کوئی یتیم بچّہ ، کوئی معذور ، کوئی اپاہج ، کوئی مسکین ، بھوکا اور بے رزق سوئے ۔ میرے نظام میں زکوٰۃ فرض ہے ۔ یعنی ہر صاحب استطاعت پر لازم ہے کہ اموال نامیہ یعنی نقد اور سونے چاندی سے چالیسواں حصّہ اور زمینی پیداوار سے بیسواں اور دسواں حصہ اور مویشیوں جانوروں سے بھی ایک ایک مقررہ تعداد میں ، غریبوں ، مسکینوں ، اہلِ حاجت کو دیتا رہے ۔ اور پھر یہ شرح لازمی ہے ۔ یعنی اگر نہ دے گا تو اسی طرح قابلِ مواخذہ رہے گا جس طرح اللہ کی براہ راست عبادت و نماز وغیرہ کے ترک سے اور پھر اس سے زیادہ جتنا بھی ہو سکے دیتا رہے ۔ یہ دنیا سب اپنے اجر و ثواب ، اپنی ہی فلاح و بہبود کے لئے ہے کسی (POOR LAW SYSTEM) کی اجرا ر کی میرے حدود کے اندر مطلق ضرورت نہیں ۔ اس نظام زکوٰۃ و صدقات کی قدر پوچھے ۔ کوئی ڈاکٹر ڈراپر امریکی سے ، اور ڈاکٹر لائیٹنر (سابق ڈائرکٹر پنجاب) اور پھر امریکہ کے ایک زندہ ماہر نفسیات و اجتماعیات ڈینیین کے وہاں سے پوچھئے کیپٹیلزم (سرمایہ داری) کی لعنت کی اصل بنیاد کیا ہے ؟ سود اور صرف سود ، شرح زیادہ ہو یا کم سود خوار ہی ایسا شخص ہے ، جو برخلاف تاجر کے جسے صد ہا

خطرات سے دوچار رہنا پڑتا ہے، اور برخلاف ورکرز (عمال) کے بے ہاتھ پیر ہلائے اور بلا کسی قسم کا خطرہ برداشت کئے مال پر قابض اور جائداد کا حصہ دار ہوجاتا ہے۔ میں نے فلسفہ معاشیات میں اُسی دُکھتی ہوئی رگ کو پکڑ کر کاٹ دیا ہے۔ اور سود کو ہر صورت میں ممنوع قرار دیا ہے، آج دنیا، اور خود ہندوستان کی دنیا۔ سرمایہ داری کے خلاف بڑے سے بڑے پُرشور نعرے بلند کر رہی ہے۔ لیکن ہے بجز میرے کسی میں یہ ہمّت کہ خون چوس چوس کر پلنے والے ساہوکاروں ہی کی نسل کا سرے سے قلع قمع کر دے؟

اس زمین میں کمیونزم کا پودا جڑ پکڑ سکتا ہے؟ اس فضا میں سوشلزم کا تخم کبھی پھول پتّیاں لا سکتا ہے؟ یہاں مراد اس جھوٹے سوشلزم اور کمیونزم سے ہے، جو مزدک ایرانی کا چلایا ہوا ہے اور جس کی ان سوڈیڑھ سو برس کی زندگی کا حاصل صرف طبقہ داری جنگ اور اخلاقی انارکی نکلا اور جو محض روس کی نقالی میں ہندوستان کے سر تھوپا جا رہا ہے، ورنہ سچی سوشلزم اور صحیح کیمونزم تو لازمۂ شرافت وانسانیت ہے، اور عین میرا جزو ہے، اور اسی کی تو مثالیں ابھی ابھی پیش ہو چکیں ——— میں نے اپنے نظام میں ہر شخص کو اس کی ذاتی محنت و اہلیت اور اس کے بزرگوں کی جائداد سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع دیا ہے اور فطرت کے قائم کئے ہوئے فرقِ مراتب کو پوری طرح قائم رکھا ہے، اور اس حد تک میں کمیونزم کا مخالف ہوں، لیکن دوسری طرف میں نے سود کو قطعی حرام کر کے

سود در سود کے چکر کو ہمیشہ کے لئے بند کر کے جائداد کو مختلف حصہ داروں میں تقسیم کر کے خیرات وصدقات کی انتہائی ترغیب دے کر اور احسان رکھنے کے بجائے انہیں خود ایک نوع کی خدمت قرار دے کر اور زکوٰۃ کی فرضیت پر زور دیکر اور ضعیفوں، مسکینوں، سب کے پورے پورے حقوق قرار دے کر، سرمایہ پرستی (کیپیٹلزم) کو بھی ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا ہے۔

موضوع کی وسعت قریباً بے پایاں، بزم کا وقت محدود و مختصر، میرے پیام کا خلاصہ در خلاصہ چند لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا کے لئے پیام امن اگر ہے تو میری ہی ذات ہے۔ خوب غور کر کے دیکھ لیجئے۔ جرائم کی تعداد روز افزوں کہاں ہے اور بمنزلہ صفر کہاں؟ چوری کے، ڈکیتی کے، نقب زنی کے، آتش زنی کے زہر خورانی کے، جعلی دستاویزوں کے، حرام کاری کے، دروغ حلفی کے، قتل کے، ضرب شدید وخفیف کے۔ خودکشی کے واقعات وہاں زیادہ پیش آتے ہیں جہاں میرے نام سے بھی عداوت ہے، یا جہاں میری تھوڑی بہت حکومت قایم ہے؟ جنون اور دماغی اور عصبی بیماریاں شدت سے کہاں پھیلی ہوئی ہیں؟ میری عملداری میں، یا میرے دشمنوں کے قلمرو میں؟ اندھے پن کے، بہرے پن کے آنکھوں اور کانوں کی طرح طرح کی پیچیدہ بیماریوں کیلئے نئے نئے آلات کی نئے نئے اسپتالوں کے کھلنے کی ضرورت کہاں پیش آرہی ہے؟ کالجوں والے یونیورسٹی والے، سینما والے، تھیٹر والے، ٹرام والے، مل اور فیکٹری والے، ورکشاپ اور مشین والے شہروں

میں، یا وہاں، جہاں ابھی تک میری سادگی قائم ہے؟ معدہ، آنت، دانت اور آلاتِ ہضم کی خرابیاں کہاں زیادہ پھیل رہی ہیں؟ وہاں جہاں بڑے بڑے شاندار ہوٹل موجود ہیں، جہاں پُرتکلف غذاؤں پر منہ ہر وقت چلتا رہتا ہے، جہاں برف اور طرح طرح کے مصنوعی پانیوں کی گرم بازاری رہتی ہے، اور جہاں سگرٹ اور سگار اور ایل اور وہسکی کے دَور ہر وقت چلتے رہتے ہیں۔ یا میرے سادہ دسترخوان پر؟ عام صحتیں کہاں درست رہتی ہیں؟ وہاں جہاں طہارت و غسل سے لوگ ناآشنا ہیں اور جہاں صبح آٹھ آٹھ اور نو نو بجے ہوا کرتی ہے؟ یا میرے ہاں جہاں طہارت اور وضو فرض ہے اور غسل کی پوری ترتیبات موجود اور جہاں سونے کے لئے لازم کہ پچھلے پہرے اگر نہ سہی تو کم از کم قبل فجر تو ضرور ہی اٹھ بیٹھے، اور دن رات میں کم از کم مسجد تک تو پانچ مرتبہ آمد و رفت رکھے۔ آتشک اور طرح طرح کی اور جان لینے والی گندی بیماریوں کا زور کہاں ہے؟ وہاں جہاں ہر پارک میں، ہر کلب میں، ہر موٹر پر، ہر ٹرین پر، ہر کشتی پر، ہر جہاز پر مرد و عورت کا آزادانہ اختلاط قایم ہے، جہاں زنانہ لباس کی عریانی یا نیم عریانی داخل فیشن ہے، جہاں نمائش جمال و زیبائش عیب نہیں، ہنر ہے اور جہاں آرٹ اور فائن آرٹ کے پردہ میں ہر بے پردگی اور ہر بے حیائی دلیل کمال ہے، یا میرے حجروں اور زاویوں میں جہاں نہ کوئی سینما کے نام سے آشنا، نہ کوئی برہنہ رقاصی کا قدردان، جہاں نہ کوئی عصمت فروشی کا بازار نہ کوئی ہائڈ پارک،

اور جہاں کے بسنے والے پابند ہیں قانون حجاب کے اور پُتلے ہیں شرم و غیرت کے؟ راحت قلب و سکون خاطر کہاں زیادہ نصیب ہے؟ وہاں جہاں چوبیسوں گھنٹے تار اور ٹیلیفون اور گراموفون اور ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر گھنگھناتے رہتے ہیں اور جہاں اخبار فروش ہر لمحہ اپنی روزی کے لئے ایک نیا ہیجان تلاش کرتے رہتے ہیں یا وہاں جہاں کے باشندے قناعت اور صبر و ضبط نفس کے فضائل کا سبق پڑھ چکے ہیں؟ غرض روح کی بالیدگی و تازگی کے سوال کو تو چھوڑیئے ٹھیٹھ مادّیات کی عینک سے مجھے اور میرے حریف کو دیکھئے اور پھر اپنی حالت کو سوچیئے۔ ع

چشم بروے من کشا باز بہ خویشتن نگر

اور بیسویں صدی سے جو مجھے چھوڑ چکی ہے اور چھوڑتی جاتی ہے کہیئے،

بہ بیں کہ باکہ بریدی و باکہ پیوستی

گو یہ بھی ایک عجیب تماشہ ہے کہ ساتھ ہی ساتھ غیر شعوری طور پر میرے قریب آتی جاتی اور میرے بکھرے ہوئے اجزا کو میرا نام زبان پر لائے بغیر، میری جانب منسوب کئے بغیر، ایک ایک کر کے اپنے اندر سمیٹتی ہی جاتی ہے۔

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

تمدّن اسلام کی کہانی

اسی کی زبانی

دینی بھائیو اور عزیزو!

بچپن کی بات، بیہوشی کا زمانہ، تاریخ کی پیدائش سے بھی قبل کا دور،

ع بھولا ہوا سا خواب ہے کچھ ہے خیال کچھ نہیں

یاد اتنا ضرور آتا ہے کہ جب اپنی آنکھ اس گوشت پوست کی دنیا میں اس آب و خاک کے کارخانہ میں کھلی تو دیکھا کہ سر پر سایہ دو خاک کے پتلوں کا ہے۔ ایک کا نام باوا آدم، دوسرے کا ماما حوّا۔ یہ لوریاں دے رہی ہیں، وہ سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ کچھ پیاری پیاری نورانی صورتیں اور بھی دھندلی سی یاد پڑ رہی

ہیں۔ فرشتہ شاید انہیں کو کہتے ہیں۔ ایک دفعہ باوا آدم نے کان میں کچھ ایسے انچھر پھونکے کہ دل میں اتر گئے، حافظہ میں گڑ گئے۔ آج تک از بر۔ بولے: "جانِ پدر! تم اولاد معنوی ہو، اللہ تمہارا اقبال بڑھائے، میری صلبی اولاد کو سدا تمہاری راہ چلائے۔ لیکن تقدیر کے نوشتہ کو کون میٹ سکتا ہے؟ لکھا ہوا یونہی ہے کہ تمہاری زندگی اوّل سے آخر تک ایک موذی سے مقابلہ میں گزرے گی، جدّوجہد میں کٹے گی، گو تمہارے اصلی جوہر بھی اسی مقابلہ سے چمکیں گے، اصلی کمالات اسی معرکہ سے ابھریں گے۔ میرا اور تمہارا ازلی دشمن، نام ابلیس، حسد کی آگ کا پتلا۔ کھل کر سامنے نہ آئے گا۔ حملہ ہمیشہ آڑ سے کرے گا۔ کہیں بہروپ بھر کر، کبھی وہ نقاب چہرہ پر ڈال کر اس کا لشکر بے شمار اس کے چہرے کے نقاب بے حساب لیکن غم نہ کرنا، اس کی نیرنگ سازیوں سے ذرا نہ ڈرنا، انجام کار فتح تمہاری ہی مقدر ہے ——" باوا آدم کی وصیتوں سے تو بس اسی قدر حافظہ میں ہے۔ ہاں خوب یاد پڑ گیا، اسی دور کا ایک حادثہ خونیں نظروں کے سامنے اس طرح پھر رہا ہے کہ گویا کل ہی کی بات ہے! ایک دن ہوا کیا کہ میں بھائی ہابیل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے معصومیت کے کھلے ہوئے چمن میں گشت کر رہا تھا کہ اتنے میں قابیل نے عفریتی حربہ سے وار کر دیا۔ ہابیل غریب کا تو خیر کام ہی تمام ہو گیا لیکن میرے جسم نے بھی زخم کا خراش اور اس کا مزہ پہلی بار جبھی جانا ——!!

دن گزرے اور گزرتے رہے سال شروع ہوئے اور ختم ہوتے رہے۔ صدیوں بعد کوئی ۳۰۰۰ ق۔م کے لگ بھگ میں نے اپنے کو سطح زمین کے اس خطہ میں جہاں

دریائے فرات بہہ رہا ہے یعنی دیار بکر اور بغداد کے درمیان اور یہیں کچھ دور پر سلسلۂ کوہستان ارارا ط واقع ہے۔ اور اس کی ایک چوٹی کا نام جبل جودی ہے ــــ جھیل وین (VANE) کے جنوب و مغرب میں اس وقت تک اولاد آدم سارے روئے زمین پر نہیں پھیل پائی تھی بلکہ سب کا مسکن یہی علاقہ تھا۔ قوم کی قوم کو دیکھا کہ اچھے خاصے ہوشیار تمیزدار، دیکھنے میں عاقل و فرزانہ، لیکن مجھ سے سب کے سب بیگانہ۔ دل سب کے میری طرف سے پھرے ہوئے اور خیر میں تو کیا چیز ہوں، پھرے میرے مالک و مولی کی طرف سے مڑے ہوئے! حرکت کیا کی کہ مجسمے بنانے اپنے بڑوں کے، سرداروں کے ــــ ناموروں کے اور پہلے تو اس کا نام محض یادگار رکھا۔ لیکن تعظیم کے ڈانڈے پرستش سے ملے ہوئے جو ٹھہرے! ۔ لگے انہیں کے آگے اپنی حاجتیں پیش کرنے، انہیں سے اپنے دکھ سکھ میں سوال کرنے۔ اگلی نسلیں گزرتی گئیں اور نئی نسلوں نے ان سے وہ معاملہ شروع کر دیا، جو بندوں کا ہونا ہے خدا کے ساتھ، مخلوق کا خالق کے ساتھ۔ گویا پتھر کی مورتیاں ان کے عقیدہ میں شریک تھیں خدا کی خدائی میں۔ حاکم و متصرف تھیں، خلق کی حاجت روائی میں ــــ عقلمندوں نے اتنا نہ سوچا، کہ جو ماورا ہے جسم و قالب سے، وہ بھلا کہیں صورت پکڑ سکتا ہے اور جو منزّہ ہے قید و تعین سے، وہ بھلا گرفت میں آسکتا ہے کسی مصوّر کے، نقاش کے، سنگتراش کے! ــــ

•

ایک مرد خدا نوحؑ بن لامک نامی اسی سرزمین سے اٹھے اور پکار پکار بولے کہ میرے بھائیو، یہ کیا اندھیر ہے! بلا کی حماقت اور انتہا کی شامت کہ بندوں کو درجہ خدا

کا دیتے ہو اور جو محض بے بس ہے اسے قدرت والا سمجھتے ہو"۔ تہذیب و شائستگی، عقل و خرد کے مدعیوں نے جواب اس وقت بھی وہی دیا جو آج دے رہے ہیں۔ بولے: "تم ایک خشک و بے مغز شخص کیا قدر جانو، ہمارے ان فنون لطیفہ کی؟ یہ مجسمہ تراشنا انہیں نمایاں مقامات پر نصب کرنا تو عین (HERO WORSHIP) ہیرو ورشپ ہے دلیل اور علامت ہے ملّی زندگی کی۔ یہ شرک و معصیت کا قصہ تم نے کہاں سے نکال لیا؟" اس زمانہ کا اوسط عمر آج سے کہیں بڑھا ہوا تھا۔ مقدس بندہ نوح نے اس بڑھے ہوئے معیار سے بھی کہیں بڑی عمر پائی۔ نیچے سے ایک عظیم الشان سیلاب امڈا، اور اوپر سے بارش ہوئی موسلا دھار۔ مخالفین، معاندین سب کے سب ڈوب کر رہ گئے۔ بس نوح اور ان کے مخلصین باقی بچ گئے۔ اشارہ غیبی پاکر حفاظت کا سامان ایک طویل و عریض کشتی کے ذریعہ سے پہلے ہی سے کرلیا تھا۔

اس طوفان عظیم کے نفس وقوع سے تو تازہ ارضیاتی (جیولاجیکل) اور اثری (آرکیولاجیکل) شہادتوں کے بعد بیسویں صدی کو انکار کی گنجائش رہی نہیں ہے۔ البتہ ہنسی آجاتی ہے جب لوگوں کو اعتراض و انکار کے لہجہ میں کہتے سنتا ہوں کہ "طوفان مقامی ہو تو ہو، عالم گیر نہیں ہوسکتا"۔ بے شک طوفان زمین کے سارے حصہ پر محیط نہ تھا اور کیوں ہوتا؟ مقصود تو صرف خطاکاروں کو غرق کرنا تھا اور وہ خطاکار قوم صرف قوم نوح تھی۔ لیکن اس ایک خطہ کے سوا اور اولاد آدم اس وقت تھی ہی کہاں؟ پس اگر قوم نوح غرق ہوئی تو اس کے تو معنی ہی یہ

63772

ہیں کہ اس وقت کی ساری دنیائے انسانیت غرق ہو گئی!

دنیا کی عمر کچھ اور کھسکی اور چند صدیاں اکھی اور گزریں تھیں کہ اسی سرزمین پر ایک قوم اور ابھری تہذیب و تمدن میں اگلوں سے بھی بڑھی ہوئی۔ ستارہ شناسی کے علم میں طاق، سنگ تراشی کے فن میں شہرۂ آفاق۔ ان کے درمیان ماہرین فن کا ہجوم صنعت گروں کی دھوم۔ مورتیں اس صفائی اور صناعی سے بناتے کہ نقل کو اصل کر دکھاتے۔ بے جان میں گویا جان ڈال دیتے۔ ترقی کا قدم سائنس اور آرٹ کی تو ان بلند منزلوں میں اور عقاید کی پستیوں کا یہ حال کہ مندر سورج دیوتا کے بنے ہوئے اور خلیفۃ اللہ انسان کے ماتھے چاند اور تاروں کے آگے سجدوں میں گرے ہوئے۔ مورتی پوجا اپنی شباب پر۔ گویا شرک کا وہی مذہب جو ہندوستان میں آج بھی رائج ہے۔ ملک وہ تھا جسے عراق کہتے ہیں۔ کبھی بابل کہا جا چکا ہے اور کبھی کالڈیا یا کلدانیہ، اس وقت ہندوستان سے کچھ ایسا دُور بھی نہ تھا۔ بلکہ خیال تو کچھ ایسا پڑتا ہے کہ سندھ کی سرحدیں اس سے ملی ہوئی تھیں اور درمیان میں یہ سمندر حائل نہ تھا اسی قوم میں میرے وہ زبردست مربی پیدا ہوئے جنہوں نے پھیکا کر دیا باوا آدم کی بھی شفقتوں اور نوازشوں کو۔ نام ابراہیم یا ابرہام۔ والد کا نام تارح یا عربی تلفظ میں آذر تھا۔ یہ ابراہیم موحد نہیں موحد گر تھے۔ موحدوں کے سردار تھے۔ شرک کا رنگ دیکھ تاب کہاں لا سکتے تھے۔ تبلیغ کی اور خوب ہی کی، توحید کے دین کی توحید کے تمدن کی، توحید کی تہذیب کی۔ تہذیب جاہلی ان سے گتھ گئی۔ حکومت اس کی نصرت پر، سوسائٹی اس کی حمایت پر۔

کوئی طریقہ جور و ستم کا ان پر اٹھا نہ رہا۔ حد یہ ہے کہ دہکتی ہوئی آگ میں زندہ جھونک دیئے گئے۔ زندگی جس کے حکم کے تابع ہے۔ اسی کے حکم سے زندہ نکل آئے! آخر ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ عراق سے شام پہنچے اور شام سے چلے تو فلسطین اور مصر سے گزرتے ہوئے حجاز میں آن کر ٹھہرے۔ جہاں کہیں بھی پہنچے، غلغلہ بلند کرتے رہے میرے دین کا، جدھر سے بھی گزرے جھنڈا لہراتے گئے میرے آئین کا۔ مکہ پہنچے تو باپ بیٹے نے مل کر وہ مکان کھڑا کر دیا جو آج تک مرکز چلا آ رہا ہے توحید کے دین کا، اہلِ توحید کے آئین کا۔

کچھ اور بعد عرب کے جنوب و مشرق میں قوم عاد آباد رہی اور پھر ان کے بعد شمال و مغرب میں قوم ثمود، دونوں کا اپنے اپنے زمانہ میں خوب زور رہا۔ تنومند، زورآور، قدآور لوگ تھے۔ اپنے تہذیب و تمدن پر نازاں۔ انجنیری، صنعت کاری، ہندسہ کے فن کے بادشاہ پتھر کے جگر پر شگاف دیتے، اور پہاڑوں کو کاٹ کر محل تعمیر کرتے، میری انکی آویزش قدم قدم پر رہی۔ ان کی تہذیب جاہلی، میری تعلیم توحیدی۔ ان کے ہاں سفرِ حیات کی ہر منزل پر اخلاق کی گندگی اور باطن کی سیاہی۔ میرے ہاں زندگی کی ہر سانس پر جلا اور قلب کی صفائی، دعویٰ ادھر قوت کا اور کثرت کا، بھروسہ ادھر صداقت کا، وحدت کا میرے علمبرداروں نے صدمے بڑے بڑے اٹھائے، دکھ جی بھر کے سہے۔ آخر میں فتح میری ہوئی اور تختہ الٹ کر رہے۔ قوت کا زعم رکھنے والوں کے، کثرت پر ناز کرنیوالوں کے۔ اور یہی انجام ہر جاہلی تمدن کا ہو کر رہتا ہے۔ شرک کی اعتقادی اور فسق کی عملی

گندگیوں سے لبریز تمدن کو تباہی اور ہلاکت سے بچا لے جانے والی نہ کوئی سپاہ آجتک دریافت ہو سکی ہے نہ کوئی قلعہ ـــــ ان دونوں قوموں سے قبل، اور قوم ثمود سے کچھ ہی فاصلہ پر اس کے شمال و مشرق میں جہاں آج شرق یردن کا علاقہ ہے۔ ایک اور قوم آباد تھی اپنے مصلح حضرت لوط کی جانب منسوب۔ اس کے تمدن کے غیر صالح، نامنزا عناصر کی ناپاکیاں، خدا کی پناہ! ـــــ بالآخر ملیامیٹ ہو کر رہی اور اب تو ایک نامور ماہر اثریات سر چارلس مارسٹن نے اس کا زمانہ تک بالکل متعین کر دیا۔ سنہ ۲۰۶۱ قبل مسیح۔ اس کی یادگار خاکی نہ سہی آبی، آج بھی عرب و شام کے درمیان بحر مردہ (DEAD SEA) کی شکل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس جھیل یا بحیرہ کے اوپر اور اندر بھی چار ہزار سال گزر جانے پر آج تک موت ہی کی عملداری ہے! نہ اندر کوئی مچھلی زندہ ہو کر سانس لے سکے، نہ اوپر کسی پرندہ کی مجال کہ پر مار کر گزر سکے! عذاب الٰہی کی بے پناہی ـــــ معاذ اللہ ـــــ!

ان سب کے بعد اور ان سب کے علاوہ ایک اور قوم بھی گذری ہے حضرت مسیح سے کوئی سنہ ۱۵۰۰ سال قبل۔ علمبردار توحید شعیب نبی کی جانب منسوب۔ تجارت پیشہ کاروباری لوگ آباد تھے علاقہ مدین میں خلیج عقبہ کے متصل، مصر، فلسطین، عرب اور بحر روم، بحر قلزم کے بیچ راہ پر۔ ان کی تہذیب میں جائز تھا دوسرے کا حق مار لینا، اپنا نفع غبن فاحش کے ساتھ حاصل کرنا، غرض تجارتی معاملات میں ہر قسم کی چالاکی اور خیانت، میری ان سے بھلا کیا نبھتی! خوب مقابلے رہے۔ یہاں تک یہ قوم بھی فنا کے اسی گھاٹ اتر گئی، جہاں ان سے قبل ان کے بہت سے پیشرو پہنچ چکے تھے۔

اب نمبر آتا ہے مصر کا۔ یہاں میرے قدم یوسف صدیق کے عہد میں ۱۸۰۰ق م ہی میں پہنچ چکے تھے اور ان کی زندگی بھر میری ہی حکمرانی رہی۔ لیکن چند روز بعد جب سلطنت بدلی تو قوم کا نظام بھی بگڑا اور ہوتے ہوتے تین چار سو برس کے عرصہ میں تو تہذیب جاہلی پورے زور شور کے ساتھ خم ٹھونک کر میرے مقابلہ پر آگئی۔ حکومت اب اس تاجدار کے ہاتھ میں تھی، جو اپنے کو بندہ نہیں، بندوں کا آقا، بندوں کا رب سمجھ رہا تھا۔ معبود اکبر سورج دیوتا "یا راع" کے اوتار اور انسانی قالب میں خدا یا فرعون "یعنی راع" کے نمائندے) تو یہاں کے فرماں روا عرصے سے سمجھے جا رہے تھے ــــ (جیسے ہزاروں برس کے بعد آج بھی میکاڈو شاہ جاپان سمجھے جا رہے ہیں۔) لیکن اب جو بادشاہ مصر کا ہوا، اس کا نمبر فساد عقیدہ و فساد عمل دونوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ میری زبان تھے اس وقت موسیٰ کلیم اللہ اور میرے ترجمان ہارون نبی اللہ۔ دونوں نے اپنی والی سب ہی کچھ کر چھوڑی۔ تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ ناسمجھ اور مشرک مزاج خلقت، دلائل سے زیادہ گرویدہ خوارق و معجزات کی ہوتی ہے۔ خالق بے نیاز نے دونوں بزرگ بندوں کے ہاتھوں اس طرح کے کرشمے بھی نہ معلوم کتنے دکھا ڈالے۔ پتھر میں جونک نہ لگنا تھی نہ لگی۔ جابر و قاہر حکومت کا غیظ و عناد بڑھتا ہی گیا۔ نتیجہ جو کچھ بھی نکلا تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے۔ مظلوم بنی اسرائیل نے چاہا کہ اپنے وطن فلسطین کو چلے جائیں، قاہرہ[1] کے قاہر کی مصلحتیں سد راہ رہیں۔ آخر ایک روز رات کے وقت موقع پا کر بنی اسرائیل نکل کھڑے ہوئے، مرد عورتیں، بوڑھے، بچے سب۔ آجکل کی سی کوئی پکی، صاف،

لہ :۔ مصر کا یہ موجودہ دارالسلطنت تقریباً اسی جگہ آباد ہے جہاں فرعون کے زمانہ میں بنی اسرائیل کی آبادی تھی۔ محلہ جاشان یا انگریزی تلفظ میں (GADCHAN)

سیدھی سڑک لگی ہوئی تو تھی نہیں، رات کا وقت، تعاقب کا خوف اور گھبراہٹ راستہ بھول گئے اور بجائے شمال کی طرف ذرا اور آگے بڑھ کر پھر مشرق کی طرف مڑنے کے پہلے ہی ادھر مڑ گئے۔ اب جو دیکھا تو سامنے سمندر یعنی بحر قلزم (REDSEA) کی شمالی مغربی آبنائے، جس کے بعد ہی اب نہر سویز شروع ہو جاتی ہے اور اس وقت خشکی تھی۔ واپس ہونا چاہا تو دیکھتے کیا ہیں کہ خود ہزامپریل میجسٹی فرعون لاؤ لشکر کی کمان کرتا ہوا بھاگو بھاگ چلا آ رہا ہے۔ اب اسرائیل غریب کریں تو کیا کریں؟ دائیں اور بائیں پہاڑ، سامنے سمندر، اور پشت پر یہ لشکر جرار! جو توحید والے تھے انہیں اشارۂ غیبی ہوا کہ بے تکلف سمندر میں کود پڑو وہ کود پڑے اور اسے اب زلزلہ بحری کا اثر سمجھئے یا جو بھی تعبیر اختیار کیجئے، بہرحال سمندر پھٹا، ان کے لئے راستہ بن گیا۔ اور وہ بخیریت اتنا حصہ عبور کر کے، جزیرہ نمائے سینا کی خشکیوں پر آ گئے ادھر فرعون نے اپنے لشکریوں کو للکارا کہ دیکھتے کیا ہو، ڈال دو تم بھی اسی طرح ان کے پیچھے سمندر میں اپنے فوجی رتھ[1] اور گھوڑے۔ فرعونیوں کا سمندر کے بیچوں بیچ پہنچنا تھا کہ پانی کی پہاڑ سی کھڑی ہوئی دیواریں آپس میں مل گئیں اور وہ فرعون جو "بے سامان" نہیں باسامان تھا مع اپنے سارے سازوسامان کے غرق ہو کر رہ گیا۔ یہ واقعہ عجب نہیں کہ ۱۴۸۰ء قبل مسیح میں واقع ہوا ہو۔

اب میرا قیام سالہا سال تک جزیرہ نمائے سینا میں رہا۔ موسیٰ علیہ السلام پر پوری شریعت اسی زمانہ میں اتری اور انہوں نے میری حکومت ایک ایک جزوی

---

[1] فوجی رتھیں اس زمانے کے سامان حرب کا اہم ترین جزو تھیں

تفصیل کے ساتھ اپنی قوم پر پھیلانی چاہی۔ خود قوم والے مخالف ہو بیٹھے۔ مخالفت کا لیڈر قوم ہی کا ایک بڑا سیٹھ، ساہوکار یا بینکر تھا۔ قارون نام، اس کی بے انداز دولت کی تفصیل بیان ہو تو کتنوں کو آج افسانہ معلوم ہو، اتنی زائد دولت کا ایک ہی جگہ اجتماع، پھر اس کے حاصل کرنے کی حرص اور اس کے خرچ کرنے میں بخل۔ بھلا یہ چیزیں کیسے ساتھ کبھی جمع ہو سکی ہیں، جو اب ہوتیں؟ فرعون تو خیر دولت ایمان ہی سے محروم تھا۔ قارون بدبخت تو خاص مومنوں کے درمیان پیدا ہو کر، ان کے درمیاں پل کر، بڑھ کر پھر انہیں سے بغاوت کر نکلا ——!

ٹیڑھا لگا تھا قط قلم سرنوشت کو!

انجام یہ ہوا کہ خود مع اپنے سارے سرمایہ کے زمین میں دھنس گیا! وقت کے ایک اور بدنصیب سامری نامی نے تو غضب ہی کر دیا۔ حضرت موسیٰ کی چند روزہ غیر حاضری میں ظالم نے بنی اسرائیل کے عقائد ہی مسخ کر دیئے اور جو توحید کی شاہراہ کے مسافر تھے، انہیں بت پرستی کی بھول بھلیاں میں الجھا دیا! مقصد گزارش یہ کہ غیر تو غیر، مجھے خود اپنوں کی بھی سرکشی، تمرد و بغاوت کا مقابلہ بار بار کرنا پڑا ہے۔

داؤد نبی (متوفی ۹۶۳ھ ق۔م)[۳] اور سلیمان پیغمبر (متوفی ۹۳۳ھ ق۔م)[۳] کے نام آپ نے سُنے ہوں گے۔ شام و فلسطین میں ولادت مسیح سے کوئی ایک ہزار سال قبل میرے ہی نمائندے تھے۔ اللہ کے پیمبر باوقار بھی اور دنیا کے نامی گرامی تاجدار بھی، ایک طرف صاحب زہد و تقویٰ، دوسری طرف فاتح اور کشور کشا، ایک طرف نظر

---

[۳] یہ دونوں سنہ سر چارلس مارسٹن کی تازہ تخلیق کے مطابق ہیں۔

میں مثال ان کی رکھئے۔ نیز مصر کے وزیر مال اور وزیر اعظم یوسفؑ ہی کی اور دوسری طرف غریب و بے زر انبیاء، اور مفلس و تہی دست اولیاء الٰہی کی ان دونوں مردوں کا وجود ثبوت ہے۔ اس کا کہ میری ذات پابند نہ غربت کی نہ امارت کی، نہ افلاس کی نہ بادشاہت کی، میری روح، میرا جوہر، میرا مایۂ حیات جو کچھ ہے، عدل ہے، اعتدال ہے، توازن ہے ادائے حقوق ہے، احساس عبودیت ہے۔ میں امیروں کے شیش محل میں جب آنکلتا ہوں تو شکر کا مظہر بن کر۔ اور غریبوں کے جھونپڑے میں جب گزر کرتا ہوں تو صبر کا پیکر بن کر۔ عیش میں خوف خدا کا نقیب ہوں، فقر میں یاد خدا کی ترغیب ہوں۔ زرداروں کو ڈراتا ہوں کہ دولت و ثروت کے اس خزانہ سے حساب پائی پائی کا دینا ہوگا۔ ناداروں کو سمجھاتا ہوں کہ اصل دولت قناعت کی تو تمہیں کو نصیب ہے۔ نہ میرا یارانہ کیٹلزم سے، نہ میری دوستی کمیونزم سے، میں دونوں کی بے اعتدالیوں کا زیادتیوں کا مخالف اور اگر خوبیاں ان میں سے کسی میں ہیں تو وہ میرا ہی عین پر تو ہیں!

اُدھر باہر یہ سب کچھ ہوتا رہا، اِدھر آپ کا ہندوستان بھی خاموش اور معطل نہیں رہا، نئے نئے مذہب، نئے نئے فلسفے، اور ان کے ماتحت نئے نئے تمدّن یہاں بھی پیدا ہوئے اور فنا ہوتے رہے، صدائے توحید بھی بے شک کبھی کبھی اٹھی— لیکن عام روش وہی مشرکانہ قوموں والی یہاں بھی جاری رہی۔ تناسخ کے عقیدہ کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ذاتی سعی کی اہمیت جاتی رہی اور انفرادی عمل کی معنویت

بالکل بے معنی رہ گئی۔ دارمدار "کرم" ٹھہرا یعنی پچھلے جنم کا ثمرہ اعمال۔ گویا اگر آج کوئی شرابی ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ ارادۃً "شراب پینے کی معصیت کر رہا ہے، بلکہ اس لئے کہ اسے "کرم" یعنی پچھلی زندگی کے اعمال کے مطابق شرابی ہونا ہی تھا۔ "ورن آشرم" کے عقیدہ نے وحدت انسانی کا تخیّل ہی پاش پاش کر دیا۔ اب انسان محض کے کوئی معنی ہی نہیں رہے اور خدا کی بنائی ہوئی انسانی وحدت تقسیم ہو گئی۔ انسان کی گڑھی ہوئی چار ذاتوں میں اور پھر ان کی بے شمار شاخوں میں۔ برہمن، چھتری، ویش، شودر، یہ چار مستقل سانچے ہر فرد کے لئے اس کی پیدائش ہی کے وقت سے موجود۔ پھر ہر ایک کی شاخیں، پھر ان شاخوں کی شاخیں، عزّت و شرافت کا معیار شخصی نہیں، بلکہ نسلی و موروثی قرار پا گیا جو اونچا ہے وہ اس لئے کہ اس کے باپ دادا اونچے تھے جو نیچا ہے وہ اس لئے کہ اس کے باپ دادا نیچے تھے۔ اور خیر ایک ذات تو دوسری ذات سے شادی بیاہ کیا کرتی، ایک ہی ذات کی ایک شاخ بھی دوسری شاخ سے پیوند نہیں لگا سکتی، ایک ہی پلیٹ میں ساتھ کھانا کھانا، ایک دوسرے کے آگے کا بچا ہوا کھانا کھانا الگ رہا، ایک دوسرے کے ہاتھ کا چھوا ہوا کھانا نہیں کھا سکتے۔ ایک دوسرے کے ہاتھ کا پانی نہیں پی سکتے۔ نیچ ذاتوں میں بھی ایسی نیچی کہ ان کا جسم اگر اونچی ذات والے کے جسم سے چھو جائے، اس کا سایہ اگر ان پر پڑ جائے تو یہ ناپاک ہو جائیں! انسان نے انسان کو کتّے سے بدتر سمجھ لیا اور لگے ایک دوسرے سے بچنے، بدکنے، بھڑکنے، جرم یہ نہیں کہ حرکتیں فلاں اور فلاں کیوں کیں۔ بلکہ صرف یہ کہ پیدائش

فلاں اور فلاں نا شدنی خاندان میں کیوں ہوئی!

وہم پرستیوں کی گرم بازاری ہو گئی۔ ضعیف الاعتقادیوں کی بن آئی۔ ہر ندی، ہر پہاڑی، ایک دیوی، ہر پہاڑ، ہر دریا ایک دیوتا، گائے بیل، سانپ، کچھوا، چوہا اور کیڑے خدا کے اوتار، پیپل، برگد، تلسی کے پتوں پتیوں میں الوہیت کے آثار۔ اکواکب پرستی کے اثر سے جوتش اور نجوم کا زور۔ فلاں دن نحس، فلاں تاریخ منحوس، چلتے وقت چھینک آگئی تو قدم آگے نہ اٹھائیے، سڑک پر کالی بلی راستہ کاٹ گئی، تو بجائے سفر کے گھر واپس آجائیے۔ زندگی میں سانس لینا دشوار، قدم قدم پر وہم پرستیوں کا پہرہ، گھر گھر میں بھوت پریت کا دور دورہ۔ آج سیتلا مائی کی جے منائیے، کل کالی دیوی کی بھینٹ چڑھائیے، بے حیائی ہر ریت رسم میں گھسی ہوئی، گندگی ہر رواج میں گھر کئے ہوئے، بہار کا موسم آئے تو ہولی منائیے، شراب پی پی کر فحش راگ گائیے۔ برسات کے ختم پر جاڑے شروع ہوں تو دیوالی کے چراغ جلائیے، لکشمی جی کی پیشوائی کے لئے جوئے کے پانسے پھینکئے اور مندروں کی دیوداسیوں کی شرمناک شرح و تفصیل کوئی اس بھرے مجمع میں کرے تو کیسے کرے؟ غرض شراب خواری، فحاشی، حرامکاری قمار بازی جائز ہی نہیں بعض موقعوں پر اور بعض موسموں میں جزو عبادت۔ اعتقاد کا اثر محض معاد و آخرت کے مسائل تک کب محدود رہا ہے؟ مجلسی، معاشری خانگی، منزلی، غرض زندگی کے چھوٹے بڑے ہر شعبہ کے ادنیٰ ادنیٰ جزئیات تک انہیں گمراہیوں کے رنگ میں رنگے ہوئے!

ہندوستان سے کچھ ہی فاصلہ پر ایران ہے اور شاید ایک ہی آریہ نسل سے دونوں قوموں کی آبادیاں ہیں، بہر حال متاثر ہندوستان سے یہ بھی بہت کچھ رہا۔ نام کے لئے اس کا مذہب اور تمدن ہندوستان سے الگ لیکن حقیقت دونوں میں بہت کچھ مشترک۔ گویا تخم ایک، درخت دو۔ بت پرستی تو بے شک یہاں کم آئی، لیکن کواکب پرستی، عناصر پرستی، شمس پرستی کچھ زیادہ ہی نمایاں۔ پہلا دھوکا تو اسی توحید کے بارے میں کھایا، جو ہر غیر الٰہی مذہب کی سمجھ سے باہر رہی ہے۔ یعنی خدا بجائے ایک کے دو فرض کئے۔ نیکی کے خدا، بڑے خدا کا مظہر نور یا روشنی کو مانا۔ اور پھر دنیا میں اس کا مظہر آگ کو قرار دیا۔ اس سے آتش پرستی مستقل طور پر لازم آگئی اسی طرح بدی کے خدا، چھوٹے خدا کا مظہر تاریکی کو ٹھہرایا اور ہر اس چیز کو جو اندھیرے سے تعلق رکھنے والی ہو منحوس قرار دیا۔ اعمال و معاملات میں کبر و نخوت عجمی تمدّن کا نمایاں عنصر۔ اونچے مرتبہ والوں کے لئے خواجگی و آقائی اور نیچے طبقہ والوں کی قسمت میں خدمت گزاری و غلامی۔ زرتشت نے (اور عجب نہیں کہ وہ پیمبر ہوں،) اپنی والی بہت کچھ اصلاح کرنی چاہی۔ پر تہذیب جاہلی کی سرشت ہی میں جو بے عنوانیاں پڑی ہوئی تھیں، وہ پوری طرح کیوں کر مٹ سکتیں۔ دولت پرستی کے اس دَور کا ردعمل آخر دولت دشمنی کی شکل میں ظاہر ہوا اور اسی کا خوبصورت نام آج ڈیڑھ ہزار سال کے بعد کمیونزم گڑھا گیا ہے۔ مزدک نامی ایک شخص اٹھا اور اس نے سوشلزم اور اس کی انتہائی صورتوں کی تبلیغ شروع کر دی۔ شخصی ملکیت کوئی چیز

نہیں، زمین مشترک، زر مشترک، یہاں تک کہ زن مشترک!

...ED BY MAL... 1906-1993

اب ایران و ملحقات ایران سے چل کر پھر سرزمین انبیاء، شام و فلسطین میں آجایئے، سنہ عیسوی ابھی شروع نہیں ہوا ہے اور سنہ ہجری کے شروع ہونے کو تو ابھی کوئی چھ سو سال باقی ہیں کہ قوم اسرائیل میں ایک ہی خاندان میں پہلے صالح ابن صالح یعنی یحییٰ بن زکریا پیدا ہوتے ہیں اور پھر عیسیٰ ابن مریم۔ دونوں کی تعلیم تمام تر قناعت، زہد، ایثار و توکل علی اللہ کی ہے۔ بگڑی ہوئی، اور مسخ شدہ ذہنیت اس سادہ تعلیم کے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ خود اپنی ہی قوم استقبال کرتی ہے اس دعوت کا بغاوت سے اور داعیوں کا عداوت سے۔ پہلے حضرت زکریا ختم کئے جاتے ہیں۔ پھر حضرت یحییٰ کا سر ایک رقاصہ کی فرمائش کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ آخر میں نوبت حضرت عیسیٰؑ کی آتی ہے۔ حکومت اعلیٰ رومیوں کی، ان کا مذہب اور تمدن مشرکانہ۔ انہیں کی ماتحتی میں فلسطین ایک نیم آزاد صوبہ تھا۔ رسم و رواج کے قتیل، ظاہر پرستی کے شہید، کبر و نخوت میں مبتلا یہود ایک مقدمہ اس پیغمبر صدیق کے خلاف، حکومت سے بغاوت و غدّاری کا گڑھ کر لاتے ہیں اور عدالت سے فیصلہ اپنے موافق حاصل کر کے اپنے نزدیک آپ کو سولی پر چڑھا ہی دیتے ہیں ادھر یہ ہوتا ہے، اُدھر آپ کے عالی معتقدوں کو ایک اور یہودی پال، یا پولوس نامی، یہ پٹی پڑھاتا ہے کہ عیسیٰؑ مسیح رسول اللہ نہیں، ابن اللہ تھے، نعوذ باللہ، خدا کے بیٹے تھے، بلکہ خود شریک الوہیت تھے اور الوہیت

میں شریک تو ایک تیسری ہستی روح القدس بھی ہے۔ ظالموں نے اس طرح پیمبر کی لائی ہوئی توحید کو اپنی گڑھی ہوئی تثلیث سے بدل دیا۔ اور مسیحی تمدّن، تہذیب قانون، معاشرت سب پر رنگ شرک و جاہلیت کا چڑھا دیا ــــــ میری عمر کا ایک دَور اس منزل پر آکر تمام ہو جاتا ہے اور اب آغاز دوسرے دَور کا ہوتا ہے۔

زمین اسی طرح چکر کاٹ رہی تھی۔ رات اور دن اپنے دورے اسی طرح پورے کر رہے تھے کہ سرزمین عرب کے مطلع سے طلوع ایک نئے آفتاب کا ہوا، آفتاب جاہ وجلال کے لحاظ سے، ماہتاب حسن وجمال کے لحاظ سے۔ اس نے مجھے آغوش شفقت میں لیا اور میں اس کے سایۂ عاطفت میں پلا اور بڑھا اب تک گویا میرا لڑکپن تھا، اب جوان ہوا اور اس عہد میں میرا شباب اپنی پوری قوت اور پوری آب و تاب کے ساتھ چمکا۔ اس میں شک نہیں کہ شروع کے تیرہ سال میرے اوپر جو کچھ گزری وہ جور و تعدّی کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ جاہلیت نے جی توڑ کر مقابلہ قدم قدم پر کیا جنگ گھٹنے ٹیک ٹیک کر چپہ چپہ پر کی لیکن ۶۱۱ء میں مکّہ سے مدینہ ہجرت محمدی، تاریخ عالم کا وہ بے نظیر واقعہ ہے جس نے انسانیت کا رُخ ہی پلٹ دیا۔ دس سال کے اندر ہی اندر میں نے دنیا کو ایک نئے نظام سے روشناس اور مانوس کر دیا۔ محض لفظاً اور قولاً نہیں، عملاً اس کا نفاذ کر دیا۔ اسے چلا کے دکھا دیا (NEW ORDER) کا چرچا آج آپ ہر طرف سن رہے ہیں، حقیقۃً (NEW ORDER) یا نظام نو تو میرا نظام

تھا۔ جمود کے خلاف ایک مستقل چیلنج (اعلانِ جنگ) دنیا کے سارے نظامات کے مقابلہ میں ایک مستمر نعرۂ انقلاب۔ ساری کہانی کے لئے فرصت اس مختصر نشست میں نہ آپ کو سننے کی، نہ مجھ کو سنانے کی، لیکن قصّہ مختصر، کچھ تو بہر حال سُن ہی لیجیے۔

میری زندگی کی روح کہئے یا جوہر، سب کو معلوم ہے عقیدۂ توحید ہے۔ اس بنیادی، مرکزی عقیدہ کا پہلا عملی اثر یہ ظاہر ہوا کہ نیم الوہیت یا فوق البشری تقدس کا خیال کسی مخلوق، کسی برتر سے برتر انسان کے لئے باقی نہیں رہنے پایا۔ عبادتیں میرے ہاں سب کے لئے بالکل یکساں، استثنار اُس قانون میں پیر، شہید، ولی، نبی کسی کے لئے نہیں۔ نماز فرض پانچ وقت کی، عوام کے لئے بھی، خواص کے لئے بھی۔ روزے فرض مہینہ بھر کے اُن کے لئے بھی، اِن کے لئے بھی۔ نماز جماعت میں جس کو جہاں جگہ مل جائے بس وہی اس کا مقام۔ یہ نہیں کہ عوام پچھلی صف میں رہیں اور اکابر امت کے لئے جگہ اگلی صف میں نکالی جائے۔ اولیائے امت کو دوسروں کی عبادتوں میں طاعتوں میں تخفیف کرنے کا حق الگ رہا، اپنے ہی لئے کسی کمی بیشی، کتر بونت کا ذرا حق نہیں رکھتے۔ کسی حلال کو حرام وہ نہیں کر سکتے۔ کسی حرام کو حلال وہ نہیں بنا سکتے سلام کے طریقے میرے ہاں ساری امت کے لئے ایک۔ بس وہی السلام علیکم (اللہ کی طرف سے سلامتی ہو تمہارے اوپر) یہی سلام بڑوں کے لئے، یہی چھوٹوں کے لئے یہی برابر والوں کے لئے، یہی عامیوں کے لئے یہی عالموں کے لئے۔ یہ نہیں کہ اونچی ذات والوں کے آگے ڈنڈوت کی جاتے۔ ان کے پیر پڑا جائے یا بڑے مرتبہ والوں کے آگے ماتھا

ٹیکا جائے، زمین بوس ہوا جائے یا ان کے لئے الفاظ بھی "آداب" اور "تسلیمات" اور "کورنشات" اور "بندگی" قسم کے ہوں!

مرد عورت کے درمیان حجاب کا قاعدہ میرے مخصوصات میں سے ہے۔ عورت پر واجب ہے بچنا بلا ضرورت ہر نامحرم کے سامنے آنے سے اور اس نامحرم کے اطلاق میں امتیاز فاسق و متقی کا نہیں رکھا ہے۔ یہ نہیں کہ پردہ عوام سے تو کیا جائے لیکن کسی تقدس مآب شیخ وقت کا سامنا ہو تو یہ قید اڑا دی جائے۔ اسی طرح معاملات ہوں جیسے وصیت یا نکاح، یا عبادات ہوں جیسے رویت ہلال یا جرائم ہوں جیسے چوری غرض جہاں کہیں بھی شہادت کا معیار کوئی عدد رکھا گیا ہے، خواہ دو کا یا چار کا وہاں یہ گنجائش کہیں بھی میرے ہاں نہیں کہ عوام اُمت ہوں تو تعداد وہی دو یا چار کی رہے لیکن اگر کوئی اپنے وقت کے جنیدؒ یا اپنے زمانہ کے ابوحنیفہؒ ہوں تو گواہی صرف ایک ہی کی معتبر مان لی جائے ——— روحانیت کے اس تخیّل سے میں ناآشنا ہوں کہ عبادت میں، معاشرت میں، معاملت میں، قانون کی، ضابطہ کی، پابندیاں فلاں کے لئے ہوں اور فلاں کے لئے نہ ہوں، حاضری عدالت سے مستثنیٰ ہو جانا آج ہر چھوٹے سے چھوٹا رئیس بھی اپنا حق سمجھتا ہے۔ میرے زمانہ میں خلیفۂ وقت بھی یہ آڑ ڈھونڈھ نہیں سکتے تھے!

•

مساوات امت کی تعلیم عبادات کے ذریعہ سے، احکام فقہی کے واسطہ سے، میرے پروگرام کی خاص مد ہے۔ نماز ہو تو جماعت کے ساتھ اور جماعت میں

ایک صف میں کھڑے ہوں عالم و عامی، محمود و ایاز، سلطان و غلام، رئیس اور گنگال، بازو سے بازو ملا ہوا ہو، شانہ سے شانہ بھڑا ہوا ہو، عطر میں ڈوبے ہوئے رئیس کا اور پسینہ میں شرابور، کاشت کار کا۔ حج کرنے امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین جائیں تو اور ان کا ادنیٰ سے ادنیٰ غلام جائے تو۔ لباس دونوں کے جسم پر ایک ہو۔ وہی بے سلا ہوا کپڑا۔ ایک چادر کمر سے بندھی ہوئی۔ دوسری صرف ایک شانہ کو ڈھکے ہوئے اوپر کے جسم پر پڑی ہوئی۔ حاضری دیں عرفات میں، کنکریاں چنیں مزدلفہ میں۔ قربانی کریں منیٰ میں۔ چکر کاٹیں خانۂ کعبہ کے۔ سعی کریں درمیان دو پہاڑیوں کے، سب ایک ہی وردی میں، خدائی فوج کے ایک ہی یونیفارم میں۔ پھر جب زندگی کے ختم پر مالک کے یہاں سے بلاوا پہنچے، تو وہی سادہ کفن کے تین کپڑے بادشاہ ہفت اقلیم کے لئے بھی اور اس کی غریب سے غریب رعایا کے لئے بھی ——— میرے اس نظام زندگی کے ماتحت باقی رہ سکتی ہے کسی گردن کش میں انانیت؟ زندہ رہ سکتا ہے۔ کسی کا "پندارِ تفوق"؟"

امارت و افلاس، دولت و فقر کے نفس امتیاز کو مٹا دینے کی غیر طبعی کوشش میں میں نے کبھی وقت ضائع نہیں کیا۔ مساوات مطلق، مالی و معاشی اعتبار سے نافذ کرنے کی خلاف فطرت تکادش میں کبھی قوت صرف نہیں کی۔ البتہ انتظام اس کا کر دیا۔ اور احتیاطیں ایسی رکھ دیں کہ اس امتیاز سے پیدا ہونے والی تلخیاں زیادہ سے زیادہ گھٹ کر رہیں ——— سانپ کی جان نہیں لی لیکن اس کے ڈسنے والے دانت نکال لئے۔ امیروں کو حکم دیا کہ اپنا بھائی سمجھیں امیروں کو بھی اور غریبوں کو بھی، امیروں کو اس لئے کہ باہمی چشمک، رشک، حسد و رقابت

کے امکانات نہ رہیں۔ غریبوں کو اس لئے کہ نخوت و خود بینی کے جراثیم فنا ہو کر رہیں اور خود غریبوں میں اپنی حقارت و پستی کا، یا آج کل کی اصطلاح میں "احساس کمتری" کا نشو و نما نہ ہونے پائے۔ غریبوں کی امداد، اعانت، دست گیری کو امیروں کے رحم و کرم و چھوڑا نہیں گیا، ان کے اوپر واجب کر دیا گیا۔ اپنے فرض کو ادا کریں گے تو خود اجر و انعام پائیں گے۔ غریبوں پر احسان اس سے ذرا بھی نہ کریں گے، احسان خود اپنی ذات پر کریں گے۔ غفلت برتیں گے تو مجرم ہو کر پیش ہوں گے۔ اپنی بھلائی اگر مقصود ہے تو لازم رکھیں گے اپنے نفس پر محتاجوں کی اعانت، مظلوموں کی نصرت، داد خواہوں کی فریاد رسی ــــــ صحیح، اصلی، سچی سوشلزم اس سے بڑھ کر اور کہاں ملے گی؟۔

کھانے پینے میں پرہیز، چھوت چھات، آپس میں تو کجا، میرے ہاں تو ان سے بھی نہیں جو مجھ سے باغی ہیں۔ میرے ہاں بڑے سے بڑا شخص جھوٹا کھا سکتا ہے ــــــ پی سکتا ہے یہ نہیں کہ اونچی ذات والا نیچ ذات والے کے ساتھ بیٹھ کر نہ کھائے۔ اس کے ہاتھ کا نہ کھائے ایک دوسرے کے برتن میں نہ کھائے۔ نہ یہ کہ جو لارڈ ہو" کامنر (COMMONER) اس کے ساتھ میز پر کھانا نہ کھا سکے"۔ اسی فوج کا پیادہ اپنے کرنل کے مس (MESS) کی طرف قدم بڑھانے کی جرأت نہ کر سکے! میرے ہاں تو منکروں سے، ہاں توحید و رسالت کے منکروں سے آفتاب پرستوں سے، کواکب پرستوں سے، عناصر پرستوں سے، پتھر کی مورتیاں پوجنے والوں سے، کسی سے بھی کھانے پینے کا پرہیز نہیں۔ سب کے آگے کا جھوٹا جائز ہے دنیا کی مذہبی تہذیبوں میں اس وسیع رواداری کی کوئی مثال؟ وحدت انسانی پر عمل میں اس حد

تک زور دینے کی کوئی نظیر؟

شادی بیاہ میں میرے ہاں صرف کفو دیکھا جاتا ہے۔ یعنی جوڑ کہ فریقین اگر معاشی و معاشرتی حیثیت سے ہم سطح ہوں گے تو آئندہ نباہ کی زیادہ توقع رہے گی باقی ذات کی اونچ نیچ کا اونچ نیچ میں کیا جانوں؟ ذات پات کا وجود ہی میرے قلمرو میں نہیں۔ پیشے اپنے اختیاری بیشک ہو سکتے ہیں لیکن آبا و اجداد کے پیشہ کی بنا پر ذات کا چل پڑنا میرے لغت میں بالکل بے معنی ہے۔ کوئی شخص اپنے ارادہ اور اختیار سے نائی کا پیشہ کئے ہوئے ہے۔ کوئی دھوبی کا، کوئی جلاہے کا، کوئی دُھنے کا، کوئی رنگریز کا، کوئی بنیئے کا، یہاں تک بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن فلاں شخص ذات کا جلاہا ہے۔ ذات کا نائی ہے۔ ذات کا دھوبی ہے۔ یعنی کسب کی بنا پر نہیں، نسب کی بنا پر خواہ مخواہ اس طبقہ میں داخل ہے، میں اس تخیّل سے نا آشنا ہوں۔ ہانک پکار کر کہتا ہے تاکہ قطعاً نا آشنا نہ ہو۔ یہ ضلالت تمام تر دورِ جاہلیت کی یادگار ہے اور کمبخت کسی حد تک میرے اندر گھس آئی ہے۔ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور قلق بھی کہ آج مسلمانوں کی بعض "ذاتیں" فریاد برپا کر رہی ہیں ہمیں نیچ سمجھ لیا گیا ہے اور سیّد، شیخ وغیرہ شریف ذاتیں "ہمیں حقیر خیال کر رہی ہیں"۔ کوئی ان سادہ طبع لوگوں کو یہ جواب نہیں دیتا کہ بندہ پرور یہ شکایت تو آپکی اپنے ہاتھوں پیدا کی ہوئی ہے۔ آپ سے کہا یہ کس مردود نے کہ آپ اپنے کو ان "نیچ ذاتوں میں شمار کرائیے؟ اونچ نیچ، شریف و رذیل کا سوال بعد کا ہے، گزارش یہ ہے کہ نفس تقسیم ہی ذات رات میں میرے ہاں کب

جائز ہے؟ آپ دیئے، کھلے خزانہ کہیے کہ ہم فلاں پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔
ٹھیک اور بالکل ٹھیک۔ لیکن جس دن آپ نے کہا کہ ہم فلاں "ذات" کے لوگ ہیں
آپ نے خود ہی الزام اپنے اوپر اوڑھ لیا۔ اپنے منہ سے اقراری مجرم بن گئے، اور
میرے دامن کی پناہ سے نکل گئے۔ ع

نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

ذات کے قائل تو غیروں کی دیکھا دیکھی آپ خود ہی ہو گئے، اور پھر خود ہی نالاں ہیں کہ ہمارے اندر یہ "ویش" کیسے، یہ "شودر" کیسے یہ اچھوت کیسے؟ —— میں کیا جانوں کیسے۔

شخصی اور خانگی زندگی کے تمام ترین اور اہم ترین واقعات شادی اور موت ہیں۔ دونوں کا ایک سرسری منظر ذرا میرے زیر اثر گھرانوں میں دیکھتے چلئے۔ مسلمان لڑکی اِدھر سیانی ہوئی، اُدھر فکر ماں باپ کو شادی کی شروع ہوئی۔ نسبت کے پیام آنے لگے۔ فکر اس کی نہیں کہ زائچہ ملایا جائے، کنڈلی ملائی جائے، منحوس گھڑی ساعت سے بچا جائے۔ گھڑی کے انتظار میں عمریں گزر جائیں، نجومی جوتشی، رمّال کا دخل کسی موقع پر نہیں۔ نہ یہ بے فکری کہ جلدی کیا ہے۔ لڑکی جوان ہو کر اپنا شوہر خود ہی ڈھونڈھ لے گی۔ عمر بھر کے شریک زندگی کا انتخاب، زندگی کا دقیق ترین، دشوار ترین، اہم ترین — نازک ترین انتخاب ہے۔ ضرورت اس میں جوش کی نہیں، ہوش کی، جذبات اور دیوانگی کی نہیں، عقل و فرزانگی کی، اچھے اچھے تجربہ کاروں کی، پختہ دماغوں کی عقلیں چکر کھا جاتی ہیں۔ عقل و تجربہ سے خالی اور جذبات سے بھری، نوجوان لڑکی یا نوجوان لڑکے

کے سر اس کا بار تمام تر ڈال دینا اور خود دور سے محض تماشہ دیکھنا، اولاد کے ساتھ ہمدردی نہیں بیدردی ہے، دوستی نہیں دشمنی ہے۔ گویا ایک پندرہ سال کی لڑکی یا لڑکے سے توقع یہ ہے کہ اسے ضروریات و جذبات کا اندازہ ہے۔ ۲۵ برس کے بھی سن کا اور ۴۵ برس کے بھی سن کا اور ۵۵ برس کے بھی سن کا! زندگی کے جو اتار چڑھاؤ، فطرت بشری کی جو نیرنگیاں، نوجوانوں کے لئے ابھی پردۂ راز میں ہیں۔ بڑے بوڑھوں کے لئے آپ بیتی بن چکی ہیں۔ البتہ صلاح و مشورے کی حد تک ان نوجوانوں کو بھی شریک رکھنا ضروری ہے کہ بہرحال رائے تو کسی درجہ میں وہ بھی رکھتے ہیں۔ غرض بڑوں نے (یا فقہا کی اصطلاح میں اولیاء نے) اپنے طور پر خوب جانچ پڑتال کر کے۔ چھوٹوں کی رائے و مرضی دیکھ کر، بات ٹھہرائی۔ جہیز کا سامان مہیا کیا گیا حسب حیثیت۔ یہ نہیں کہ جہیز کے لئے قرضہ اتنا لیا جائے کہ آخر میں نوبت خودکشی کی آجائے۔ کورٹ شپ کا قدم کسی منزل میں درمیان میں آنے نہ پایا اور مسلمان عروس اور اس کا شوہر دونوں ان بیحیائیوں سے بچ گئے۔ جن سے آج اس روئے زمین پر بے شمار گھرانے جہنم کا نمونہ بن کر رہ گئے ہیں۔ خیر یہ مرحلے طے ہو لئے تو ایک تاریخ سعید نکاح کی قرار پائی۔ دلہن کے گھر پر دولہا والے اور خود دلہن والے جمع ہوئے۔ شوہر سے اسکی حسب حیثیت ایک رقم مہر کا اقرار کرایا گیا ـــــــ ایک زندہ ہستی اپنے کو دوسری زندہ ہستی کے سپرد کر رہی ہے۔ آخر اس کا کچھ تو نذرانہ چاہیے۔ اسی نذرانہ کا نام مہر[1] ہے۔ اب ضابطہ و

---

[1]: ۔ صاحب ہدایہ کے الفاظ ہیں: المہر واجب شرعاً ابانۃ لشرف المحل (مہر ایک حق شرعی ہے۔ اعزاز محل یعنی زوجہ کیلئے نذرانہ کا لفظ اسی اعزاز کے مفہوم کو ادا کر رہا ہے۔

قانون کے مطابق اقرار پہلے لڑکی سے کرایا گیا اور پھر لڑکے سے۔ چپ چپاتے نہیں۔ علانیہ۔ لڑکی سے عورتوں کے مجمع میں، لڑکے سے مردوں کے جلسہ میں۔ اور قبل اس کے کہ شوہر اپنی زبان سے اتنی بڑی ذمہ داری کا اقرار کرے، اس کے سامنے خطبہ پڑھا گیا۔ میری سرکاری زبان عربی میں۔ اس خطبہ میں نہ شاعری ہوتی ہے نہ خیال آرائی۔ اس میں بیان ہوتی ہیں نکاح کی فضیلتیں اور برکتیں، زوج و زوجہ کے باہمی حقوق کی اہمیت اور خوفِ خدا کی تاکید۔ اس کے بعد حسب حیثیت عزیزوں اور دوستوں کی دعوت۔ بس لیجیے، ہو گیا نکاح مسلمان مرد کا مسلمان عورت کے ساتھ۔ خدا کا واسطہ درمیان میں لا کر دو خدا پرستوں کی زندگیاں ایک کرا دی گئیں اور بارک اللہ کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ شروع سے آخر تک نہ مشرکانہ اور وہم پرستانہ رسوم کی ٹیم ٹام۔ نہ باجے گاجے، ناچ رنگ، آتشبازی کی دھوم دھام۔ نہ غیروں کے ہاں کی طرح میرے ہاں یہ قید کہ نکاح وہی پڑھائے جو خاندان کا لگا بندھا ہوا پنڈت پروہت ہو یا باضابطہ پادری ہو۔ نہ میرے ہاں یہ پابندی کہ نکاح صرف گرجا کے ہال کی طرح مسجد ہی کے دالان میں ہو سکے۔ ہر جگہ ہو سکتا ہے۔ ہر شخص پڑھا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ شوہر خود ہی اپنا نکاح گواہوں کے سامنے پڑھ سکتا ہے! میرے ہاں تو انگریزی الفاظ میں (EVERY MAN IS HIS OWN PRIEST) کی تصدیق قدم قدم پر موجود۔ اور یہی وجہ ہے کہ جو قومیں مجھ سے متاثر اور میرے زیرِ نگیں ہیں ان میں کسی کی زبان میں (PRIEST) اور (PRIESTHOOD) کا صحیح ترجمہ بھی موجود نہیں!۔

اب موت کے منظر کی طرف آیئے۔ بیمار بستر مرگ پر پڑا ہے۔ تیماردار اس کے پاس سے ہٹیں گے نہیں، طاعون ہو یا ہیضہ، اس سے ڈریں گے نہیں۔ عزیز تو عزیز ہی ہیں غیر تک اس کی خدمت میں لگ جائیں گے اور یہ کچھ اس پر احسان سمجھ کر نہیں۔ اپنے لئے باعث سعادت سمجھیں گے۔ نزع کا عالم طاری ہے۔ عزیز و قریب ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ کوئی سورۂ یٰسین سنا رہا ہے۔ کوئی کلمۂ توحید بہ آواز بلند پڑھ رہا ہے کوئی محض اللہ اللہ کر رہا ہے کہ رخصت ہونے والے کے کان میں اس عالم ناسوت کی جو آخری آواز پڑے۔ وہ اللہ کا نام اور توحید کا کلمہ ہی ہو۔ مریض کی حالت اور گری اب اسے قبلہ رُخ کر دیا گیا کہ جدھر روح کی توجہ ہے۔ اسی طرف جسم کا رُخ بھی ہو جائے میسّر ہوا تو منہ میں آب زمزم کے قطرے ٹپکا دیئے گئے کہ اس دارِ فانی سے کوچ کرتے وقت آخری ناشتہ اسی پاک پانی کا ہو۔ سانس رکی اور ادھر منہ پر اور آنکھوں پر پٹیاں لپیٹ دی گئیں کہ ظاہری شکل کے احترام میں بھی فرق نہ آنے پائے۔ اگر آنکھیں کھلی رہ گئیں، یا ہونٹ کھلے رہ گئے، تو ممکن ہے کسی دیکھنے والے پر برا اثر ڈالیں ــــ یہ دھجیاں غسل کے وقت تک لپٹی رہیں گی۔ تاکید ہے کہ ہاتھ یا پیر یا کوئی عضو اکڑا نہ رہ جائے۔ بدمنظری کسی طرح کی نہ پیدا ہونے پائے

یہ ہو چکا تو اب اہتمام غسل کا شروع ہوا۔ پانی نیم گرم کہ تازہ نعش کے جسم کو ناگوار نہ ہو۔ کپڑے احتیاط سے اتارے گئے۔ پہلے وضو کرایا گیا، پھر پورا غسل دیا گیا ــــــ حتی الامکان اعزا اقربا اس سعادت میں حصہ لیتے رہے "میری حکومت میں نہ تنہا برہمن"

کی قسم کی کوئی ذات ہے نہ (UNDERTAKER) کے قسم کا کوئی پیشہ۔ گور و کفن کی ساری خدمتیں خود آپس ہی والے انجام دیں گے۔ غسل کے بعد اُجلا اُجلا بے سلا، نیا لباس زیب تن کیا گیا، کافور اور دوسری خوشبوؤں میں بسا ہوا۔ وضو میں جو اعضا دُھلتے تھے اور نماز میں جو اعضا فرش زمین سے لگتے تھے، انہیں خاص طور پر کافور سے منور کیا گیا کہ کل جن اعضاء کو چمکنا ہے۔ اس کی کچھ جھلک تو آج ہی ظاہر ہو جائے۔ اب جنازہ سج دھج سے روانہ ہوا، یہ نہیں ہوا کہ لاش گاڑی پر لاد دی جائے، یا پیشہ ور مزدوروں سے یہ بار اٹھوایا جائے اور خود موٹروں پر بیٹھ، سگریٹ اور سگار کا دھواں اڑاتے ہوئے ساتھ چلا جائے کہ گویا یہ بھی کوئی تفریحی تقریب ہے۔ عزیز قریب، بڑے چھوٹے، یہ وہ سب پیدل ساتھ چل رہے ہیں۔ سر جھکائے ہوئے، کاندھا دیتے ہوئے، زیر لب کلمہ پڑھتے ہوئے۔ گویا میت کوئی بڑی معزز و محترم ہستی ہے اور یہ سب اسکی سواری کے کہار ہیں۔ مسلمان کا مرتبہ مر کر گھٹا نہیں۔ کچھ بڑھ ہی گیا۔ میت محلہ کے بھشتی کی ہے نائی کی ہے، موچی کی ہے اور جنازہ کو دیکھئے کہ شیخ صاحب بھی ہاتھ لگاتے جاتے ہیں اور سید صاحب بھی، ڈپٹی صاحب بھی اور جج صاحب بھی، نماز ہوئی اور سب نے مل کر پڑھی ——— وہ میری اجتماعیت آخر کہاں جائے ——— نماز میں دعا ہوئی مغفرت کی اور سلامتی ایمان کی۔ تنہا اسی میت کے لئے نہیں، ساری امت کیلئے۔ زندوں کیلئے بھی اور مُردوں کیلئے بھی (حیّنا و میّتنا) چھوٹوں کیلئے بھی اور بڑوں کے لئے بھی۔ (صغیرنا و کبیرنا) جو حاضر ہیں ان کے لئے بھی جو غائب ہیں ان کے لئے بھی (شاہدنا و غائبنا)

مَردوں کے لئے بھی، عورتوں کے لئے بھی (ذکر نا و انثیٰنا) غرض یہ کہ سب کے لئے اور وہ بھی غائب کے مجہول اور مضمحل صیغہ میں نہیں، جیتے جاگتے، ہوشیار و بیدار جمع متکلم کے صیغہ میں ——— زمین دوز مکان سوندھی کچّی مٹی کا پہلے سے تیار ہے ——— کیوڑہ چھڑک اسے معطر کر دیا گیا اور پھر زمزم کے اگر چند قطرے میسّر آ گئے ——— جب تو خاکدانیوں کا رشتہ کہنا چاہیئے ——— کہ اس لمحہ آسمانیوں سے جڑ گیا۔

آگ میں ڈالا نہیں گیا، کسی دیوی دیوتا کے نام کا منتر نہیں پڑھا گیا۔ کسی بند میدان میں چھوڑ آیا نہیں گیا کہ چیل اور کوّے اور گدھ نوچ نوچ کر کھالیں مٹّی کے پتلے کو اسی مٹی کے مکان میں ادب و احترام سے اتارا گیا کہ عنصر، عنصر سے ہم آغوشی کی لذّت قیامت تک پاتا رہے ——— جسم کو اتارتے گئے اور مکین و مکان دونوں کے خالق کا نام لیتے گئے اور آخر آخر گواہی دیتے گئے کہ یہ سرکار کا باغی نہیں ——— وفاداروں میں، اطاعت کیشوں میں تھا ——— (بسم اللّٰہ و باللّٰہ و علیٰ ملۃ رسول اللّٰہ) دروازہ بند کیا ——— اوپر سے مٹّی ڈالتے گئے اور خوشخبری کا سرکاری پروانہ سُناتے گئے۔ منہا خلقنٰکم، اسی سے تو ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا، تمہارا گوشت پوشت اسی سے تو بنایا تھا، یہ مٹی تو تمہارے لئے مانوس ہے۔ مرغوب ہے، محبوب ہے، اس سے وحشت کیسی؟ دہشت کیسی؟ وفیہا نعیدکم، اب اسی کی طرف تمہیں پھر لوٹا رہے ہیں ——— قطرے کو دریا

سے ملا رہے ہیں۔ دمنہا تخرجکم تارۃً اخریٰ اور یہ اندیشہ کرنا کہ وجود شخصی کی لذّت ہمیشہ کے لئے آج ختم ہورہی ہے۔ ابھی تو وجود دائمی کی نعمت سے سرفرازی ملنے والی ہے اور وہ اسی سے نکل کر ملے گی۔

شادی اور موت کے ساتھ ولادت کے منظر کو بھی یاد کرتے چلئے۔ بچّہ نے ادھر دنیا میں قدم رکھا ادھر جسمانی پاکی کے بعد اس عالم ناسوت کی سب سے پہلی صدا جو قصد داہتمام کے ساتھ اس کے کان میں پہنچائی جاتی ہے، وہ کون سی ہوتی ہے؟ وہی اللہ کی بڑائی کی ـــــ اللہ کی توحید کی ـــــ رسول کی رسالت کی ـــــ وہی حرف، کتاب زندگی کی بائے بسم اللہ بھی، اور تائے تمت بھی۔ اور وہی ایک نقش رفیق نظر رہے اس کتاب کے ہر باب میں ـــــ ہر فصل میں ہر صفحہ میں ـــــ ہر سطر میں ـــــ

شادی، موت، ولادت کے موقع تو پھر بھی کبھی کبھی آنے والے ہیں، میری بستی میں تو بسنے والوں کے روزانہ زندگی کے ایک ایک جزئیہ کو لیجیے، ہر سمت جلوہ توحید کا، ہر آن نعرہ تکبیر کا! آپ اپنے ہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دوست عزیز ملنے آئے آپ ان کا مزاج پوچھتے ہیں وہ آپ کا جواب دونوں کی زبان سے نکلتا ہے ـــــ "الحمدللہ خیریت ہے"۔ امتحان میں پاس ہوئے، مقدمہ جیتے، کہیں سے انعام ملا، بیماری سے شفا پائی، اولاد ہوئی ـــــ غرض خوشی کی کوئی بھی صورت بڑی یا چھوٹی ادھر پیدا ہوئی اور ادھر زبان پر آیا وہی "الحمدللہ" ـــــ!

اور تو اور آپ محفل میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ چھینک آئی، آپ بولے الحمد للہ پاس ہی سے جواب ملا: یرحمک اللہ! کوئی بیٹھنے سے اٹھنے لگا، گرنے سے سنبھلا باہر سے گھر میں قدم رکھا، گھر سے باہر کے لئے قدم نکالا، دستر خوان بچھایا پانی کا گلاس منہ سے لگایا، جلسہ میں تقریر شروع کی اور خدا جانے اسی قسم کے کتنے بے شمار موقعوں پر زبان نے کہا "بسم اللہ ــــ! صبح سویرے آنکھ کھلی اور زبان نے پہلی دفعہ جو تلفظ کیا۔؟ وہ وہی لا الہ الا اللہ! کسی حادثہ کی خبر آئی، کوئی دنیا سے رخصت ہوگیا ــــ کوئی قیمتی چیز غائب ہوگئی، دل کو صدمہ پہنچا ــــ اور زبان نے ادا کیا: "انا للہ" کسی کا دل بڑھانا ہوا، ہمت دلانی ہوئی اور آپ نے کہا "ما شاء اللہ" کسی کا شکریہ ادا کرنا ہوا اور آپ کی زبان پر آیا "جزاک اللہ" کسی کو داد دینی ہوئی اور آپ بولے "سبحان اللہ" اپنی کسی غلطی کا احساس ہوا، کسی سے معذرت کرنی ہوئی اور آپ نے پکار کر کہا: "استغفر اللہ" یا "لا حول ولا قوۃ الا باللہ" شادی کی محفل میں اِدھر دولہا نے کہا "قبول کیا" ادھر پاس سے نعرہ لگا "بارک اللہ" اپنا یا کسی کا دل گرمانا ہوا تو زبان نے پکارا "اللہ اکبر! دل میں جذبہ شدید پیدا ہوا حیرت کا یا عظمت کا یا نفرت کا اور آپ بول اٹھے۔ "معاذ اللہ" ــــ العظمۃ اللہ ــــ اللہ اللہ ــــ یا "الا اللہ"! کبھی کوئی گندہ قول نقل کرتا ہوا، تو زبان نے پیش بندی کی کہ ــــ "نعوذ باللہ" کسی کو رخصت کرنا ہوا تو زبان پر آیا "خدا حافظ" ــــ "فی امان اللہ"

کسی سے ملے، کسی سے رخصت ہوئے، کسی کو خط لکھنے بیٹھے تو زبان یا قلم پر آیا۔
"السلام علیکم و رحمۃ اللہ"، کسی سے مصافحہ کیا تو زبان نے کہا: "یغفر اللہ لنا و لکم"۔
کسی موقع پر صفائی پیش کرنی ہوئی، کسی الزام سے تبری کرنی ہوئی اور آپ پکارے
"حاشا للہ" کوئی وعدہ کرنا ہوا، کوئی ارادہ ظاہر کرنا ہوا اور زبان سے بے ساختہ
نکلا ——— "انشاء اللہ" ——— میت کو قبر میں اتارا تو کہا ——— "بسم اللہ
وباللہ و علی ملۃ رسول اللہ" کسی کو اپنی بات پر زور کے ساتھ یقین دلانا ہوا تو کہا
"واللہ ثم باللہ!!"

میرے اور میرے والوں کے یہ عام معمولات کسی سے چھپے ہوئے ہیں؟
بڑے، چھوٹے، دوست، دشمن، سب پر عیاں ہیں۔ خدا کا نام۔ اللہ کا ذکر
میری روح کی غذا ہے۔ میرے زندگی کا جزو ہے ——— میری گفتگو کا تکیہ
کلام ہے۔ سوتے، جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، اس کثرت سے ذکر
الٰہی کی توفیق اور کسی قوم کو ہوئی ہے؟ خالق اور مخلوق دونوں کے حق ادا
کرنے میں ایسی قوم کا قدم کسی سے پیچھے رہ سکتا ہے ———؟ حد یہ ہے کہ
جو عقیدۃً مسلمان نہیں صرف مسلمانوں کے پڑوسی رہے ہیں جن کے دل
مسلمان نہیں صرف زبانیں مسلمانوں کی زبان بولنے لگی ہیں وہ تک اسی رنگ
میں رنگ گئے ہیں۔ اسی ہوا میں رس بس گئے ہیں ——— "سبحان اللہ"،
اور "انشاء اللہ" کے کلمے کشمیری پنڈتوں کو بے ساختہ بولتے اور کائستھوں

کہ بے تکلّف لکھتے کس نے نہیں سُنا ہے؟ کس نے نہیں دیکھا ہے؟۔

معاشرت کے ان منظروں کی سرسری سیر کے بعد اب میرے مالی اور معاشی نظام کی طرف آیئے۔ تجربہ کی بات کہی، جس نے بھی کہی کہ دنیا میں جھگڑے فساد کی جڑ یہی تین چیزیں ہیں۔ زر، زمین، زن اور ان تینوں میں زر سب سے مقدم۔ دنیا کے کسی حصّہ میں نکل جایئے، جنگ اور بلوے، مقدمہ بازیاں اور جعلسازیاں، خونریزیاں اور فوجداریاں جو آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ ان کا جائزہ لے ڈالیے۔ سب کا نہ سہی، اکثر کا سرچشمہ یہیں سے ابلتا نظر آئے گا ——— دوسرے مذہب، دوسرے تمدن، دوسرے فلسفے، ظاہر پرستیوں میں پڑ کر اوپری علامتوں کو اصل مرض سمجھ بیٹھے ——— کسی نے سنیاس کا بھبھوت مل دھرم کی گنگا جلی اٹھائی کہ روپیہ کا ہاتھ سے چھونا حرام ——— جو چھوئے اس کا جسم ناپاک ہو جائے ——— ؟؟ اور پولوس کی بھیڑوں کا گلہ تو اپنی کتاب مقدس میں یہ نوشتہ پا رہا ہے کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے نکل جانا آسان ——— اور دولتمند کا آسمانی بادشاہت میں داخلہ مشکل ——— ! اور کسی کے دل پر دولت کی عظمت کا اور اہمیت کا وہ سکّہ بیٹھا کہ اس نے لکشمی دیوی کے نام سے دھن دولت کی مستقل پوجا شروع کر دی ——— ! شرک و جاہلیت کے مذہبوں میں افراط و تفریط

کی یہ مثال کچھ انوکھی اور نادر نہیں۔

اب مجھے دیکھئے، میں نے کس طرح مرض کی ظاہری علامتوں کو نہیں ــــــ بلکہ صداقت کے ساتھ اصل اسباب مرض کی تشخیص کی۔ اور سانپ کے زہریلے دانت الگ کر، کس بے فکری کے ساتھ سانپ کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا ــــــ میں نے اعلان کیا کہ حرام دولت نہیں ــــــ دولت کی ہوس ہے ــــــ کسب زر نہیں ــــــ جمع زر ہے ــــــ دولت کی محبت عین دنیا کی محبت ہے ــــــ اور جو دنیا کو برتنے کے بجائے اس کے جال میں پھنس گیا، وہ میری برکتوں سے کورا رہ گیا ــــــ

روپیہ کی مثال تو پانی کی سی ہے ــــــ بہتا رہے ــــــ چلتا رہے ــــــ تو بڑے سے بڑے دریا ــــــ ساگر ــــــ سمندر بھی کام ہی کے ہیں ــــــ تفریح کے ذریعہ ہیں، صحت کے خزانہ میں، کبھی پانی اگر رکا ــــــ ایک جگہ اگر جم گیا ــــــ تو بس نالے اور تالاب بھی گندگی کے گھر ہیں ــــــ بیماری اور تعفن کے اڈے ہیں ــــــ

لیکن دنیا کو برتنا ــــــ دنیا کو صحیح طور پر استعمال میں لانا ــــــ فرائض میں داخل ہے ــــــ اس لئے روپیہ جائز طریقہ پر کمانا، ــــــ بہ قدر ضرورت تحصیلِ زر کرنا، لازمۂ حیات ہے ــــــ روپیہ کماؤ ــــــ لیکن کھاؤ اور کھلاؤ ــــــ البتہ اس چشمہ پر بند نہ لگاؤ ــــــ

اس دھارے کو بہتا ہوا رکھو۔ کسبِ معاش کے لئے ہاتھ پیر نہ ہلانا، راہب بن جانا، بھیک اور نذر کرنا، اپنے کو بھکشو کہلانا، جس مذہب میں بھی عبادت ہو، قربِ الٰہی کا ذریعہ ہو، میرے ہاں ننگِ انسانیت ہے، توہینِ آدمیت ہے۔ کسبِ معاش پر میرے آقا و سردار نے زور دیا ہے اور بھیک مانگنے سے شرم دلائی ہے تجارت، زراعت، صنعت، حرفت، ملازمت، مزدوری کے صدہا دروازے میرے ہاں کھلے ہوئے۔ ان میں سے ہر جائز پیشہ اختیار کر لینا میرے ہاں باعثِ فخر، موجبِ اجر۔

مشرکانہ اور ملحدانہ تہذیبوں میں جُوا بالکل جائز ہے۔ جائز ہی نہیں بعض صورتوں میں واجب۔ تہواروں کے دن بہ طور شگون، جُوا کھیلنا جزوِ مذہب تھا، اور ہے۔ تفریح تو بغیر اس کے گویا ہو ہی نہیں سکتی اور اب تو یاروں نے زندگی اور صحت پر بھی پانسے ڈالنے شروع کر دیئے ہیں، جان اور تندرستی کو جوئے کے داؤں میں لے آئے ہیں اور حسبِ معمول نام اس کا بھی ایک شاندار سالا ئف انشورنس رکھ دیا۔ میں نے آکر پہلی بار جوئے کے دستور پر ضربِ کاری لگائی اور بتایا کہ اس کی ہر صورت حرام۔ نرد اور پانسہ کا ہر کھیل حرام۔ نقد و جنس کی بازی لگا کر تفریح اور تماشہ کی ہر قسم حرام۔ لاٹری ناجائز، گھوڑ دوڑ پر، فٹ بال پر بازی لگانا ممنوع۔ انشورنس کمپنیوں کی "پالیسیاں" کارنیوال میں لکی بیگ (LUCKY BEG) اور اخبارات میں لفظی معمّے، میری چرڑھ۔ ماؤنٹ کارلو کا مشہورِ عالم قمار خانہ آج تہذیبِ جاہلی کا سب سے بڑا زندہ کارنامہ ہے۔ فرنگستان کا سب سے بڑا اجوا گھر

جس کمپنی کے پاس اس جوئے گھر کا ٹھیکہ ہے اس کی آمدنی کا حساب تو کون لگائے گا۔ موٹا اندازہ اس سے کیجئے کہ اس بے اندازہ آمدنی پر جو ٹیکس وہ دے رہی ہے، صرف اس ٹیکس کی رقم ایک لاکھ پونڈ (۱۳½ لاکھ روپیہ) سالانہ کی ہے! اور ابھی ۱۹۴۷ء تک یہی ٹیکس ادا کرتی رہے گی ——— میری عملداری میں اس طرح کا ادارہ کسی کے خواب و خیال میں بھی آسکتا ہے؟ میرے ہاں کی کتابی تعلیمات کو چھوڑیئے، عملاً بھی میری تاریخ کے دور میں کوئی مانٹ کارلو ملے گا؟۔ کسی راجہ نل کا وجود نظر آئے گا؟۔

جوئے کے ساتھ، بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر دوسری چیز جو جاہلی تہذیب کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے، وہ اس کا شوق سود خواری ہے۔ میرے سوا ساری تہذیبوں نے سود لیا ہے، سود دیا ہے اور جاہلیت جدید نے تو سوسائٹی کے دشمن، سود خوار کو سوسائٹی میں اعلیٰ اعزاز کے مقام پر پہنچا دیا ہے "بینکنگ" کا عظیم الشان نظام اس تہذیب کے بڑے چھوٹے کہنا چاہیئے کہ سب ہی اداروں کو دبوچے ہوئے ہے اور بینکر ہونا، ساہوکار ہونا، بینک کا منیجر ہونا۔ بینکنگ کمپنی کا ڈائرکٹر ہونا، جاہ و منزلت کے ایک اعلیٰ منصب پر فائز ہونا ہے۔ یونان، روم، ہندوستان، سود کے نقصانات محسوس سب کر چکے تھے۔ لیکن ہمت کسی کی نہ ہوئی کہ اسے روکنے کا قدم اٹھائے۔ خود آج اگر سودی قرضوں کا قدم درمیان سے اُٹھ جائے، یہ جنگ جہاں سوز جو سارے عالم کے خرمن

امن کو جلاتی، پھونکتی، راکھ بناتی چلی آرہی ہے، کئے دن، کئے گھنٹے جاری رہ سکتی ہے؟ جان کی ہلاکتیں، مال کی بربادیاں، دیکھ سب رہے ہیں، بھگت سب چکے ہیں یہ ہمت مجھی کو، ہاں صرف مجھی کو ہوئی کہ حرام کردیا میں نے سود کی ہر شکل کو۔ سود مفرد کو۔ سود مرکب کو، سود لینے کو، سود دینے کو، سود کی کتابت کو، اس کتابت پر شہادت کو۔ دنیا میں (NEW ORDER) نظام نو صرف میں نے چلایا۔ حرمت کا فتویٰ صرف کتابوں تک محدود نہیں رہا۔ عملاً روحوں میں قوت اس سے پیدا کردی۔ دلوں میں حقارت اس کی بٹھا دی۔ چھوڑیئے میری مقدس کتابوں کی تعلیمات کو، سوال کیجئے میری تاریخ سے۔ کوئی شائیلاک میری تاریخ کے بھی کسی دور میں پیدا ہوا ہے؟ میری عمر اتنی آئی اور بے شمار انقلابات میں نے اپنے اندر دیکھ ڈالے۔ اچھے برے، عادل ظالم، قانع طامع، سب ہی قسم کے حکمراں میرے نظام کے ماتحت پیدا ہوئے، یہ کسی دور میں نہ ہوا، بجز اسی بیسوی صدی کے، کہ مسلم بینک اور مسلم ساہوکارے کھلے ہوں۔ مسلم کواپریٹو سوسائیٹز قائم ہوئی ہوں۔ مسلم انشورنس کمپنیاں وجود میں آئی ہوں۔ مسلم مہاجن ہونے پر فخر کیا گیا ہو۔ رائے عامہ (پبلک اوپینین) میں نے ایسی تیار کردی کہ "بیاج" کے نام ہی سے، بوڑھے بچے، عالم و عامی، سب کو بیزاری پیدا ہو گئی۔ مجھ میں جب تک قوت رہی، مجال بھی کوئی اسم قسم کا خیال بھی لا سکتا۔ یہ تو اب جب مجھ پر ضعف غالب ہو گیا، اور آثار انحطاط کے، اضمحلال کے، ظاہر ہونے لگے، جب سے اس عفریت نے

پھر سر نکالا اور اپنے چہرے پر طرح طرح کے رنگین اور دلکش نقاب ڈال ڈال کر کام لینا شروع کیا ہے! تو ایک طرف میں نے سخت سے سخت پہرے بٹھا دیئے۔ ناجائز طریقوں سے پیدا کی ہوئی دولت پر اور بیٹھے بٹھائے محض بخت و نصیب کے زور سے انبار کی پھٹ پڑنے والی ثروت پہ، دوسری طرف وہ زور دیا اکل حلال پہ کہ قوت بازو سے، صحیح طریقوں پر دولت کمانے کے ڈانڈے عبادت سے ملا دیئے، بیوی بچوں کی پرورش کا، کنبہ قبیلہ کی خبرگیری کا مرتبہ اوراد و نوافل سے اونچا کر دیا، تیسری طرف ہمروبازاری کر دی، گداگری کی، نذر و نیاز کی۔ چوتھی طرف حق قائم کر دیئے امیروں پر غریبوں کے، رئیسوں پر رعایا کے، زرداروں پر ناداروں کے اور فرض کر دی، اعانت عزیزوں پر عزیزوں کی پڑوسیوں پر پڑوسیوں کی، انسان پر انسانوں کی — زکوٰۃ جو نہ ادا کرے وہ گنہگار، صدقہ، فطرہ، اور تحفۂ عید قرباں جو نہ پیش کرے وہ خطاکار، میرے ہاں دستور یہ نہیں کہ چندہ کا اعلان مقدم ہو، چندہ پر میرے ہاں تو قاعدہ یہ ہے کہ داہنا ہاتھ دے اور بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو! میرے فرزند راتوں کو چھپ چھپ کر حاجتمندوں کو نواز آتے تھے کہ رات کے اندھیرے میں وہ انہیں پہچان بھی نہ سکیں۔ دنیا نے اتنی ترقی میرے زمانہ میں نہیں کی تھی کہ شام کو اعلان ہو چندہ کا اور صبح کو آنکھیں تلاش کر رہی ہوں اخبار کے کالموں کی۔ ہے شکریہ کا ریزولیوشن ہے "حکام والا مقام"، کی خوشنودی کا پروانہ!

اور پھر میں قریب بھی نہیں گیا اس ظالمانہ فیصلہ کے کہ جائداد منتقل

ہوتی رہے۔ باپ سے، بڑی اولاد کی طرف اور باقی ساری اولاد گویا منہ دیکھتی رہ جائے۔ بلکہ انتظام یہ کیا کہ جائداد تقسیم ہو اور تقسیم در تقسیم ہوتی رہے۔ بجائے سمٹے رہنے کے۔ بجائے ایک جگہ جمع رہنے کے، اس کے چھوٹے چھوٹے حصے ہو جائیں اور وہ حصے پھیلا دیئے جائیں زیادہ سے زیادہ حقداروں میں۔ اولاد اگر ہے تو حصہ ساری اولاد پائے، بڑی بھی، چھوٹی بھی، لڑکے اپنے لائق، لڑکیاں اپنے لائق۔ بیوی اگر ہے تو بیوی حصہ پائے' اولاد اور بیوی کے بعد اور عزیز ہیں۔ ماں ہیں، باپ ہیں، بھائی ہیں، بہن ہیں، وقس علیٰ ہذا۔

غرض اس ہر جہتی انتظام سے میں نے مسئلہ دولت کو ایسا جکڑا کہ کوئی راہ ہی نہ رہی شیطان کی آمد و رفت کی۔ اور ایک ایسا عادلانہ، متوازن، معتدل نظام، مالی و معاشی، اپنے ہاں قائم کر دیا کہ گنجائش ہی نہ رہی جذبات رشک و حسد کے ابھرنے کی اور کمیونزم، سوشلزم اور کسی ازم کے سوالات کے چھڑنے کی! اور وہی دولت جو تجربہ سمجھ لی گئی تھی شر و فساد کا، بغض و عناد کا، میرے ہاں سکہ بن گئی جنت کی خریداری کا، ذریعہ ہو گئی خالق و مخلوق کی خدمت گزاری کا۔

جمہوریت (ڈیماکریسی) اور آمریت (ڈکیٹرشپ) کے مناقشے اور عوامیت و خواصیت کے مناظرے میرے ہاں بے سود ہی نہیں، بے معنی بھی۔ میرے ہاں حکومت صرف ایک کی، لا غالب الا اللہ قانون صرف ایک کا، ان الحکم الا اللہ النساں

سلیم الفطرۃ انسان دنیا میں صرف اسکا نائب، جامد اور ذی حیات سارے عنصروں پر، اس کے قانون کو نافذ کرنے والا، قانون اساسی بنا بنایا موجود قرآن پاک کے صفحات میں۔ اس کی شرح و تفصیل محفوظ رسول پاک اور آپ کے صحابیوں کی حیات بابرکات میں۔ کوئی سوال ایسا نہیں، نہ معاد، نہ معاش کا اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں، نہ شخصی نہ اجتماعی، جس کا حل میرے ہاں اصلاً نہ موجود ہو۔ کوئی مرض بڑا ہو یا چھوٹا ایسا نہیں جس کا نسخہ میری بیاض میں درج نہ ہو ــــــ تلاش و طلب شرط ہے۔ ــــــ ع

اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست!

میرے آقا و سردار کا طریقہ یہ تھا کہ سُنتے سب کی تھے، بولنے اور کہنے کا موقع بڑے اور چھوٹے سب کو دیتے تھے۔ عمل، سب کچھ، اور سب کی، سننے کے بعد اس پر کرتے جو آپ کی رائے میں مناسب ہوتا۔ یہ تھا۔ صحیح احساس اپنی ذمہ داری کا اور یہ تھی سچی جمہوریت یا شورویت۔ یہی حال آپ کے بعد آپ کے سچے جانشینوں کا، آزادی ہر شخص کو بولنے کی بلکہ ٹوکنے کی ہر وقت۔ ہیں اس طرز کی جمہوریت سے ناواقف، کہ رائے صرف اسمبلی اور کونسل کے ممبر دے سکیں اور ممبر آبادی کے تناسب سے محدود ہوں فلاں تعداد میں، عمر کے حساب سے امتحان کی ڈگری کے لحاظ سے، آمدنی کے میزان کے معیار سے۔ اور اس محدود و مخصوص طبقہ کے باہر قوم کا معزز سے معزز شخص بھی لاکھ چاہے مگر

زبان نہ کھول سکے۔ مقدس حلقے میں قدم نہ رکھنے پائے! ایسی آزادیٔ رائے کے اس مفہوم سے بھی محروم کہ رائے پیش صرف اس وقت کی جاسکے جب پارلیمنٹ کا سیشن، کونسل کا اجلاس ہو رہا ہو اور سال کے باقی سارے وقت زبانوں پر مہریں لگی رہیں! میرے ہاں قید نہ بوڑھے کی، نہ جوان کی، نہ امیر کی نہ غریب کی، نہ پڑھے لکھے کی نہ ان پڑھ کی، نہ مرد کی نہ عورت کی جو کلمہ گو چاہے، اور جب چاہے دنیا کے سب سے بڑے ڈکٹیٹر (خلیفہ) کو ٹوک دے! میرے کانسٹیٹوشن میں لاکھوں، کروڑوں کی دولت لٹانے کی ضرورت نہ کسی پارلیمنٹ ہاؤس پر نہ کسی کونسل چیمبر پر نہ اس کے عظیم الشان اسٹاف پر نہ اس کے گرانبہا فرنیچر پر، بس مسجد اور صحن مسجد مع اپنے بوریوں کے، چٹائیوں کے، مصلّوں کے شخصی و اجتماعی ہر ضرورت کے لئے کافی۔ اس کے در ہر وقت کھلے ہوئے ضرورت نہ اردلیوں کی نہ سنتریوں کی، نہ جمعداروں کی، نہ پہرہ داروں کی فوج کی، نہ کسی ایک دربان تک کی!

اس طرز حکومت کو بھی ڈر کسی اندرونی کشمکش کا ہے؟ میرے ہاں بھی کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے افسری، ماتحتی کا، حاکمی و محکومی کا؟ جھگڑا پیدا کرنے والا جو اصل کانٹا ہوتا ہے، وہی میں نے راہ سے دور کر دیا، نہ بڑے کو موقع افتخار کا چھوڑا اپنی بڑائی پر نہ چھوٹے میں پیدا ہونے دیا احساس کمتری۔ خلیفہ اور نائب السلطنت سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ پیادہ اور چوکیدار

تک، سب کے سب عبادت الٰہی سمجھ کر، مشین کے پرزوں کی طرح اپنے اپنے فرض، اپنی اپنی ڈیوٹی میں لگے ہوئے ــــــ مشین کے پرزوں کو بھی کبھی کسی نے دیکھا ہے ایک دوسرے سے رشک و حسد کرتے ہوتے یا ایک دوسرے سے بھڑتے ہوئے، جھگڑتے ہوئے؟ بس یہی کیفیت راسخ کر دی تھی میں نے اپنے ماننے والوں میں اتار دی تھی ان کے دلوں میں۔

چھوڑیئے خلافت راشدہ کے واقعات کو، کہ وہ بار بار کہے جا چکے ہیں اور آپ میں سے اکثر کے کان میں پڑ چکے ہوں گے۔ جانے دیجئے۔ عمر بن عبدالعزیز کو بھی۔ صدیوں بعد کے محمود غزنوی اور ملک شاہ سلجوقی کو لیجئے کہ ان کا شمار ٹھیٹھ دنیا دار بادشاہوں میں ہے۔ غزنوی کے ہاں ایک معمولی رعایا فریاد لے کر پہنچتا ہے کہ "جہاں پناہ! رات کے وقت کوئی با اختیار عہدہ دار میرے ناموس پر ڈاکہ ڈالنے میرے گھر پھاندتا ہے۔" بادشاہ یہ استغاثہ سن، اپنے اوپر کھانا پانی حرام کر لیتا ہے، رات کا منتظر رہتا ہے۔ جب رات ہو لیتی ہے، بذات خود، اندھیرے میں تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے مظلوم کے گھر پہنچ جاتا ہے اور جب مجرم کو قتل کر لیتا ہے جب کہیں جا کر پانی پیتا ہے۔ ہے کوئی مثال اس کے قریب قریب بھی، بیسویں صدی کی بہتر سے بہتر جمہوریت میں آمریت میں؟ سلجوقی ایک پل سے گزرتا ہوتا ہے کہ ایک غریب ضعیفہ راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے "اے بادشاہ! تیرے لشکریوں نے میری بکری

پکڑ لی ہے۔ بتا کہ انصاف یہاں ہو گا یا پل صراط پر؟" مشرق کا جاہ و حشم والا تاجدار جواب دیتا ہے کہ "وہاں نہیں، یہیں اسی پل پر" اور اس پر عمل کر کے دکھا دیتا ہے۔ پھر وہی سوال کہ اس کی ہے کوئی نظیر آج بہتر سے بہتر آئین اور دستور رکھنے والی حکومتوں میں ـــــ؟ دنیا لفظی بحثوں کے چکّر میں الجھی رہی اصطلاحات اور مزید اصطلاحات کے الجھاوے میں پڑی رہی میں نے عمل سے دکھایا، کھلی آنکھوں سب کو مشاہدہ کرا دیا کہ بہترین نظامِ سیاسی اسے کہتے ہیں ـــــ!

قانون میرے ہاں کا مبنی زیادہ سے زیادہ حق و عدل، زیادہ سے زیادہ اعتدال و توازن پر۔ اوّل تو میری حکومت میں جو اخلاقی و معاشرتی ماحول، جو انفرادی و اجتماعی فضا تیار ہوتی ہے وہ خود ہی جرم کش و جرائم دشمن ہے۔ مجرم کے لئے اس میں نشو و نما کا کوئی موقع ہی نہیں اور پھر ان حالات میں کوئی بدبخت اگر جرم کر ہی بیٹھے تو میری عدالتوں میں اس کا ثابت ہونا نہایت دشوار اس لئے کہ سزا میرے ہاں شبہات پر نہیں دی جاتی اور محض قرینہ، قیاس، یا شہادتِ ضعیف بھی میرے ہاں کسی کو مجرم بنانے کے لئے کافی نہیں۔ گواہیاں ہونی چاہئیں اور وہ بھی معتبر چشمدید۔ گواہی کا نصاب عموماً دو گواہوں کا ہے۔ لیکن جہاں معاملہ آپڑتا ہے مسلم یا مسلمہ کی عزّت، حرمت، ناموس کا وہاں نصاب اس کا بھی دوگنا کر دیا گیا ہے۔ کیوں کبھی ایسی زبردست گواہیاں

ملنے لگیں اور کیوں کبھی کوئی مجرم سزا پانے لگا؟ اس لحاظ سے دیکھئے تو مجھ سے زیادہ نرم قانون شاید دنیا کے پردے میں کہیں بھی موجود نہ ہو لیکن دوسری طرف اتنی براہ پوشیوں کے بعد، صفت ستاری کے اتنے مظاہروں کے بعد بھی جب جرم ثابت ہو گیا، تو اب مجرم پر رحم و کرم کے معنی ہیں جرم نوازی و جرم پروری کے۔ سزا کے نفاذ کے وقت میرا قانون سزا دے گا۔ سزا کے ساتھ تمسخر نہیں کرے گا۔ سزا ایسی ہو گی جو مجرم کو عمر بھر کے لئے سبق دے دے، مظلوم کے دل میں ایک حد تک ٹھنڈک پیدا کر دے، دیکھنے والوں کے دل عبرت سے تھرا دیئے۔ میرے یہاں یہ ہو نہیں سکتا کہ نام جیل خانہ کا لے کر سامان تفریح خانہ کے بہم پہنچا دیئے جائیں اور جن کا مقام فسق و فجور کا جہنم ہے، انہیں لا لا کر مخمل کے گدوں پر، آراستہ کوچوں پر، پرتکلف صوفوں پر بٹھایا جائے۔ جنگل کے شیر او رچیتے، ریچھ اور بھیڑیئے اگر انسانی بستیوں میں آزادی سے گھومنے پھرنے کے لئے کھلے چھوڑے نہیں جا سکتے تو یقیناً ان اخلاقی درندوں کو بھی کٹہروں اور پنجڑوں میں بند کرنا ہو گا، شکنجوں میں کسنا ہو گا بلکہ ضرورت ہوئی تو انہیں فنا کے گھاٹ اتارنا ہو گا۔

جو شرابی اللہ کی لاکھوں نعمتوں کو چھوڑ، پانی کی، عرق کی بے شمار لطیف قسموں کو ٹھکرا کر شراب جیسی گندی اور طبعاً مکروہ چیز کو منہ لگاتا ہے اور اس سے لذت لینے میں اپنے سارے جسم کو شریک کرتا ہے وہ شامت زدہ ہے اس قابل کہ اس کے جسم پر اتنے کوڑے برسائے جائیں کہ قانون الٰہی توڑنے

کاش اس کا عمر بھر کے لئے ہرن ہو جائے جو بدبخت جائز آمدنی کے سارے ذریعہ چھوڑ اور ان کی ناقدری کر کے، اپنے بھائی کے گھر میں نقب لگا کر سوسائٹی سے امن اٹھا رہا اور دوسروں کو ان کے رزق سے محروم کر رہا ہے، اس کی سزا بھی یہی ہے کہ اس کا دست آزمرے سے قطع کر دیا جائے اور وہ ساری عمر ٹنڈا بنا ہوا اپنی بدبختی کا اشتہار دیتا پھرے۔ جو خبیث شادی کے ایک نہیں چار چار موقعوں اور ان کے لئے ہر قسم کی سہولتوں، آسانیوں کے باوجود اپنی بہنوں بیٹیوں کے ناموس کو غارت کر کے اپنا منہ کالا کرتا، اور معاشرہ میں اخلاقی اور جسمانی دونوں قسم کے امراض خبیثہ کا بیج بوتا ہے، وہ ناشدنی اس قابل ہی نہیں کہ زندہ چھوڑا جائے اور اپنے وجود اور اپنی مثال سے شیطان کی ذریات کو خوش کرتا پھرے ——— میری آب و ہوا صرف صالحین ہی کو موافق آسکتی ہے۔

یہ جو کچھ عرض ہوا کوئی فرضی افسانہ نہیں، کوئی تخیلی مضمون آفرینی نہیں، ٹھوس واقعات اور سنجیدہ ثابت شدہ حقائق ہیں۔ اپنے عروج شباب کے زمانہ میں حکومت میں نے لاکھوں میل مربع پر کی، میرے قلمرو میں ایک آدھ صوبہ نہیں، پورے پورے ملک داخل رہے ہیں، پوری پوری شہنشاہیاں۔ تاریخ کے شاہد عادل سے پوچھ دیکھئے، میرے دور دورہ میں ریکارڈ جرائم کا گنہگاریوں کا، سیہ کاریوں کا کیا تھا؟ اور اب کیا ہے؟ ڈاکہ، چوری کے، نقب زنی کے

زہر خورانی کے اعداد اس وقت کیا تھے اور اب کیا ہیں؟ سود خوری اس وقت بھی گھروں کو اجاڑ رہی تھی؟ پورے پورے خاندانوں کا صفایا کر رہی تھی؟ ملکوں ملکوں آگ لگا رہی تھی؟ عصمت فروشی کی دوکانیں اس وقت بھی باضابطہ حکومتوں کی سرپرستی میں کھُلی ہوئی تھیں؟ بے حیائیاں اس زمانہ میں بھی قدرو عزت کی نگاہ سے دیکھی گئی تھیں؟ نشہ بازی کی سرکاری سرپرستی، فخرو اعلان کے ساتھ، اس وقت بھی محکمہ آبکاری کے نام سے، محکمہ افیون کے نام سے ہوتی تھی؟ قمار بازیاں، شراب خواریاں، جعلسازیاں اس وقت بھی آج کی طرح اپنے گندے اور گھناؤنے چہروں پر صدہا نقاب، خوشنما، خوش رنگ ڈالے ہوئے ابلی پڑتی تھیں؟ امراض خبیثہ کے لئے لاکھوں روپے کے صرف سے اسپتال پر اسپتال کھلنے کی ضرورت جب تھی یا اب پڑ رہی ہے؟ آنکھ کی، کان کی، دل کی دماغ کی، معدہ کی، دانت کی، آنت کی بیماریوں کا شمار اس وقت کیا تھا، اور اب کیا ہے؟ شراب کی، افیون کی، کوکین کی، ہیروئن کی، غرض ہر نشیلی چیز کی تجارت اور کاروبار زوروں پر اب ہے کہ اس وقت تھا ــــــ؟ "کل" کو جانے دیجئے، آج بھی میں، زبون حال و شکستہ بال، جس حد تک جہاں کہیں بھی متصرف ہوں، شیطان کی گھاتیں کس حد تک چل پاتی ہیں؟ نجد میں، حجاز میں، یمن میں، سینما، بے شک نہیں ہیں، اسٹیج اور اسکرین کی دلفریبیوں کی جگہ بے شک سناّٹا ہے۔ بڑے بڑے بلینک، ساہوکارے بلاشبہ بہ منزلہ نہ ہونے

کے ہیں۔ ناچ گھروں، شراب خانوں کی تعمیر میں بے شک ایک اینٹ بھی نہیں لگی ہے اور آرٹ گیلری کی تو بھنک بھی ابھی کانوں میں نہیں پڑنے پائی ہے۔ لیکن ساتھ ہی کیا حال ہے چوریوں کا، ڈکیتیوں کا، رہزنی کا خودکشی کا اور ان تمام خبائث کا، رذائل کا، غوایل کا، جنہیں آپ کا مشرقی ضمیر آج بھی لعنت ہی بھیج رہا ہے۔

میرا شباب عرصہ ہوا رخصت ہو چکا میری قوت مدّت ہوئی ضعف میں تبدیل ہو چکی، طرح طرح کے امراض، عوارض کا خود شکار ہوں، ایرانی تمدّن، ہندی تمدّن، فرنگی تمدّن کے اختلاط نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے بگاڑ ڈالنے میں میری صورت کے، میری سیرت کے، میری شخصیت کے۔ آئینہ دیکھوں تو خود اپنی شکل نہ پہچان سکوں۔ اس پر بھی اپنے تمام حریفوں پر بھاری ہوں، کیا اعتقادی اور خیالی معیار سے اور کیا عمل و تجربہ کے اعتبار سے اور میرے فرزندو اور عزیزو! یہ تمامتر تمہارے اختیار میں ہے کہ ہمت کرکے مجھے جلاؤ، اسلامی ہفتہ بجائے سال میں ایک بار منانے کے، سال کے ہر ہفتہ مناؤ، ہفتہ کے ہر دن ہر گھنٹہ، ہر لمحہ مناؤ۔ یہ رچ جائے تمہارے جسم کے ریشہ ریشہ میں، بس جائے تمہاری روح کے گوشہ گوشہ میں، کام لو خودداری سے، غیرت سے حمیت سے، صلابت سے، تو مجھ میں پھر آسکتی ہے وہی طاقت، وہی قوت، وہی حدت، وہی شدّت، وہی رعنائی، وہی زیبائی اور دنیا کی آنکھوں کے سامنے دوبارہ منظر پھر سکتا ہے ——— علی مرتضٰی کے فضل وکمال کا، عمر فاروق کی شوکت واقبال کا، محمدی جاہ وجلال کا، احمدی حسن وجمال کا!

ضمیمہ

(منقول از صدق لکھنؤ) مورخہ ۳۰ر نومبر ۱۹۴۱ء

کسی مسلمان طبیب کو نسخہ لکھتے آپ نے دیکھا ہے ——— ؟؟
معالج کوئی اکیلے مسلمان تھوڑے ہی ہیں۔ حکیم، ڈاکٹر، وید کے پیشے میں ہر مذہب اور ملّت کے لوگ ہیں۔ سوال مسلمان طبیب کے نسخے کے باب میں ہے ———
ہاں تو مسلمان طبیب نسخہ لکھنے کو قلم اٹھاتا ہے تو شروع دوا سے نہیں کرتا، دعا سے کرتا ہے، قبل اس کے کہ نام ایک دوا کا بھی لکھے، نام دوا اور تاثیر دوا کے خالق کا لیتا ہے اور سب سے پہلے نسخہ کی پیشانی پر، ہوالشافی لکھتا ہے —!

مریض کو سناتا ہے کہ شفا کہیں میرے ہاتھ میں نہ سمجھ لینا، وہ اختیار اور قدرت میں تو کسی اور ہی کے ہے، میں تو ایک بے بس اور بے جان واسطہ ہوں۔ اپنے نفس کو بتاتا ہے کہ تاثیر دواؤں میں نہیں، دواؤں کے خالق میں ہے۔ میں خود کیا چیز ہوں جو کچھ بھی ہے میرا پروردگار ہی ہے۔ دنیا پر اعلان کرتا ہے کہ شفا کسی دیوی دیوتا کے بس میں نہیں۔ اِن کے اُن کے ہاتھ میں نہیں، صرف ایک مالک ومولیٰ قادر ومختار کے ہاتھ میں ہے!

طب کو طب "یونانی" کہتے ہیں اور یونان، معلوم ہے کہ دین داروں اور متقیوں کی نہیں، مشرکوں اور بت پرستوں کی بستی تھی۔ وہاں تو پوجا صحت وشفا کے دیوتا عسقلیبوس کی ہوتی تھی اور منتیں اور نذریں اس کی لڑکی ہائیجیا (HIGIEA) کے مندر پر چڑھائی جاتی تھیں۔ (انگریزی لفظ "ہائیجین"، جو علم حفظانِ صحت کے معنی میں مستعمل ہے اسی دیوی کے نام سے مشتق ہے۔) وہاں کا طبیب اعظم بقراط تو توحید کے نام سے بھی شاید نا آشنا ہو۔ اور مشہورِ عالم ماہرِ فن جالینوس شرک کے مندر کا پجاری تھا۔ اس کافر کو مومن بنانا، اس مشرک سے کلمۂ توحید پڑھا دینا کام فرزندانِ اسلام کا تھا، اعجاز خود دینِ فطرت کا تھا ——— ! جس چیز کو چھو دیا اسے اپنا بنالیا جس راستہ سے گزر گیا، اُدھر سے خوشبو توحید کی آنے لگی۔ جس عمل میں ہاتھ لگا دیا۔ اسے عبادت بنا دیا۔ نسخے ہندو اور عیسائی، یہودی اور پارسی،

سکھ اور جین، سب ہی لکھتے ہیں اور اپنے نزدیک خلق خدا کی خدمت کرتے رہتے ہیں، مسلمان کے قلم نے اس نسخہ نویسی کو بھی براہ راست خالق اکبر کی عبادت بنا دیا!

اشخاص میں، افراد میں، انقلاب پیدا ہوتے سب ہی نے دیکھا ہے۔ جماعتوں، گروہوں، طبقوں تک کی کبھی کبھی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ لیکن علم و ادب کا نقطۂ نظر بدل دینا، فنون و صنایع کا رُخ ہی سرے سے پلٹ دینا، ایک اشارہ سے سفلیات کو عُلویات کا رنگ دے دینا، فرشی کو عرشی بنا دینا، یہ کارنامہ ہے بے مثال اور بے مثل، ہماری تاریخ کا ــــ اکیلی طب پر موقوف نہیں، فلسفہ اور منطق اور ہیئت اور خدا معلوم اور کیا کیا خاک بلا۔ ہم نے دوسروں ہی سے لیا، منکروں اور مشرکوں، ملحدوں اور بیدینوں سے لیا اور دم کے دم میں کیا سے کیا کر دیا!

خود نہ تھے جو راہ پر، اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا!

جو گمراہیوں کے گڑھ تھے، وہی رشد و ہدایت کے مرکز بن گئے جو راستہ کا خشک اور مُردہ پتھر تھا، وہ ہیرے کی چمک دمک کے ساتھ جی اٹھا! اور جو عنصری تھا، اسے زیادہ سے زیادہ ملکوتی بنا دیا تھا ــــ ایک دَور وہ تھا

اور ایک دور یہ ہے کہ تہذیبِ جاہلی کی تجدید کے ساتھ، انسانیت کا ہر عنصر درندگی میں تبدیل ہو گیا اور مطمح نظر بجائے ملکوتیت کے بہیمیت قرار پا گیا۔ وہی چوپایوں کی طرح علوم عالیہ عقلیہ روحانیہ سے غفلت، وہی درندوں کی طرح کھانے پینے، لڑنے بھڑنے، ایک دوسرے کو نوچ لینے، پھاڑ کھانے میں انہماک، وہی جانوروں کی طرح حیوانی خواہشوں کی تکمیل کے بعد سو رہنے پڑ رہنے کی عادت، وہی چرندوں اور پرندوں کی طرح دوڑ بھاگ، اچک پھاند اور اڑان کی تیزی کو حاصل ترقیات اور خلاصۂ کمالات سمجھنے کی خصلت اور ٹھیک وہی بے ہوشی اور بے خبری اور اجنبیت فرشتوں کے نام سے، اللہ کے احکام سے، جنت کے ذکر سے، آخرت کی فکر سے ؟ ؟ ؟

ختم